امام جعفر صادق علیہ السلام

(سائنسی نظریات و فکری مکالمات)

محمد خالد جذبی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ
وَّاٰلِہٖ وَ بَارِکۡ وَسَلِّمۡ

امام جعفر صادق علیہ السّلام
(سائنسی نظریات و فکری مکالمات)

ضابطہ
جملہ حقوق محفوظ ہیں
کتاب : امام جعفر صادق علیہ السّلام
(سائنسی نظریات و فکری مکالمات)
مؤلّف : محمد خالد جذبی
ناشر : حُسین پبلیکیشنز گوجرانوالا
کمپوزنگ: سجاد کمپوزنگ سنٹر گوجرانوالا
طباعت : شرکت پرنٹنگ پریس لاہور
اشاعت : مارچ ۲۰۰۹ء
تعداد : ۱۱۰۰
قیمت : ۷۰ روپے

انتساب

والدِ گرامی

جناب محمد حسینؒ صاحب

کے نام!

محمد خالد جذبی

باکمال آدمی، باکمال کتاب

محمد خالد جذبی بھی کمال کے آدمی ہیں۔ کمال کا آدمی وہی نہیں ہوتا جو اوجِ کمال پر پہنچ جائے۔ کمال کا آدمی وہ ہوتا ہے جو وقت کے تقاضے پہچانے اور اُن کے مطابق عمل بھی کرے۔ آج نہ صرف پاکستان، بلکہ پوری اُمتِ مسلمہ کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ وہ کیونکر اپنی صدیوں سے بچھڑی ہوئی علمی و معقولی روایت کو از سرِ نو زندہ کر کے خود کو عصرِ حاضر کی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ اِسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے محمد خالد جذبی نے قرونِ اولیٰ کے ایک ایسے عظیم سائنس دان کے سائنسی نظریات پر قلم اُٹھایا ہے جنھیں عام طور پر ہمارے سائنس کے مؤرّخین و محققین نامعلوم وجوہ سے دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کرتے رہے ہیں۔

امام جعفر صادق رضی اللّٰہ عنہ امام حسین رضی اللّٰہ عنہ کے پڑپوتے، امام زین العابدین رضی اللّٰہ عنہ کے پوتے اور امام محمد باقر رضی اللّٰہ عنہ کے فرزند تھے۔ گویا علم اُنھیں ورثے میں ملا تھا۔ اُن کے والد بھی سائنس دان اور فلسفی تھے۔ اُن کے درس میں ارسطو کی فزکس بھی پڑھائی جاتی تھی۔ اُس وقت ارسطو کی فزکس میں حیوانیات، نباتیات اور ارضیات بھی شامل تھے۔ اگر طبیعیات کو علم الاشیا سمجھا جائے تو پھر ارسطو کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اِن موضوعات اور مضامین کو بھی طبیعیات میں شامل کرے۔

سائنس کا مطلب اگر اشیا کی حقیقت عقل سے معلوم کرنا ہے تو اِس کی دعوت قرآنِ مجید نے دی ہے۔ بےشمار آیات میں غور و فکر اور تدبّر کا حکم آیا ہے، پھر غور کرنے کے لیے انفس و آفاق کے مظاہر کی طرف توجّہ دلائی گئی ہے اور مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ آیات کی مزید تشریح حضور صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی احادیث میں موجود ہے۔ یہی تو قرآن کا معجزہ تھا کہ جاہل معاشرے کو عقل کی طرف

رجوع کرنے کے لیے کہا گیا۔ قرآن اور حدیث کا علم حضرت علی کرم اللّٰہ وجہہٗ سے ہوتا ہوا امام جعفر صادق رضی اللّٰہ عنہ تک پہنچا۔

امام صاحب نرے سائنس دان نہیں تھے۔ وہ اپنے درس میں طبیعی علوم کے ساتھ ساتھ دینی علوم کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے درس میں صرف اُخروی اُمور پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ دُنیوی اُمور پر بھی توجہ دی۔

جذبی صاحب نے امام صاحب کے سائنسی نظریات کا مختصر مختصر تعارف پیش کیا ہے، جن کے بارے میں اُنھوں نے ایک مرتبہ اپنے درس میں پیشگوئی کر دی تھی کہ ایک دن ایسا آئے گا جب انسان اُن علوم سے فائدہ اُٹھائے گا جن سے فی الحال عملی طور پر استفادہ نہیں کر رہا، اور یہ بات محال ہے کہ علم انسان کے لیے فائدے مند نہ ہو، البتہ انسان زمانے، حالات اور استطاعت کے دائرے میں رہتے ہوئے مختلف علوم سے استفادہ کر سکتا ہے۔

جذبی صاحب نے امام صاحب کے سائنسی نظریات کے علاوہ اُن کے دو فکری مکالمات بھی پیش کیے ہیں۔ یہ دونوں فکری مکالمات فلسفہ و دانش کی دنیا میں عربی زبان کے کلاسیک کے طور پر مشہور ہیں۔

جذبی صاحب کی کتاب مختصر ہے، لیکن کمال کی کتاب ہے۔ کوزے میں دریا بند ہے، لیکن دریا کی اپنی اہمیت ہے۔ وقت کی ضرورت ہے کہ امام صاحب کے افکار و نظریات پر ایک مفصّل اور جامع کتاب مدوّن کی جائے، اِس کے لیے ہمّت چاہیے، وہ جذبی صاحب میں بدرجۂ اتم موجود ہے؛ اِس کے لیے وقت بھی چاہیے، صاف بات ہے، وہ جذبی صاحب کے پاس نہیں ہے۔

سیّد قاسم محمود

☆

ترتیب

شخصیت

سائنسی نظریات

فکری مکالمات

☆

شخصیت

نقشِ حیات

ولادت: ۱۷ ربیع الاوّل ۸۳ھ / ۲۱ اپریل ۷۰۲ء، مدینۂ منورہ

شہادت: ۱۵ شوال المکرّم ۱۴۸ھ / ۲ دسمبر ۷۶۵ء، مدینۂ منورہ

حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام خاندانِ نبوّت ورسالت اور ولایت وامامت کے ایک عظیم وجلیل فرد تھے۔ آپ حضور آقا کریم صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے نواسے، حضرت امام علی علیہ السّلام وحضرت سیّدہ فاطمہ علیہا السّلام کے بیٹے اور حضرت امام حسن علیہ السّلام کے بھائی حضرت امام حسین علیہ السّلام کے پڑپوتے، حضرت امام علی زین العابدین علیہ السّلام کے پوتے اور حضرت امام محمد باقر علیہ السّلام کے بیٹے تھے۔ آپ کی والدہ حضرت اُمِّ فروہ رضی اللّٰہ عنہا تھیں جو حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر رضی اللّٰہ عنہما کی بیٹی تھیں۔ آپ جامع الصّفات و مجمع الکمالات انسان تھے۔ آپ نے اُس وقت علم وعرفان کا چراغ روشن کیا جب ملّتِ اسلامیہ میں طوائف الملوکی اور فکری انتشار کا دَور دَورہ تھا۔ ہر طرف عناد و

فساد اور بے چینی و بدامنی پھیلی ہوئی تھی اور عوام و خواص علم و ہدایت کے بجائے جاہ و منصب اور سیم و زر کے حصول میں سرگرداں تھے۔ ایسے حالات میں آپ نے انسانی سوچ کا رُخ حقیقت پسندی کی جانب موڑ دیا۔ آپ نے اپنی شخصیت، کردار، اعمال، افعال، گفتار، ارشادات، خطبات اور مقالات سے فکری بصیرت کو اُجاگر کیا اور دینی علوم کی ترویج کے ساتھ ساتھ سائنسی تحقیقات کے لیے بھی جدید راہیں اُستوار کیں۔ آپ کا مدرسہ ایک عظیم الشان بین الاقوامی یونیورسٹی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اِس عظیم دانش گاہ کا حلقۂ تعلیم و تدریس نہایت وسیع تھا۔ اِس میں مختلف علاقوں کے چار ہزار سے زائد طلبہ علم حاصل کرتے تھے۔ اِس عظیم اسلامک ریسرچ سینٹر سے بڑے بڑے عالم، مُفکّر اور سائنس دان فارغ التحصیل ہوئے۔ آپ کے مشہور شاگردوں میں امام ابوحنیفہ کوفیؒ، مالک مدنیؒ، سفیان ثوریؒ، داؤد طائیؒ، ایوب سجستانیؒ، شعبہ بن حجاجؒ، یحییٰ بن سعیدؒ، سفیان بن عینیہؒ، وہیب بن خالدؒ، ابن جریحؒ، ابو عاصمؒ، ہشام بن حکمؒ اور جابر بن حیّانؒ شامل ہیں۔ آپ نے دین، فلسفہ، جغرافیہ، ہیئت، منطق، جفر، کیمیا، طب، تشریح الاجسام، افعال الاعضا، فلکیات، طبیعیات اور مابعد الطبیعیات وغیرہ پر بہت کچھ لکھا ہے اور ہر شعبۂ علم پر قرآن و حدیث کی رُو سے ایسی روشنی ڈالی ہے کہ اہلِ علم حیران ہیں۔ آپ نے آج سے تیرہ سَو سال پہلے مختلف سائنسی حقائق کی جانب اشارے کیے تھے جو آج جدید سائنسی علوم کی بنیاد میں شامل ہیں۔ یہ تمام سائنسی حقائق آپ نے علمِ لدنّی سے استنباط کیے تھے۔

☆

سائنسی نظریات

تخلیقِ کائنات

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے آج سے سیکڑوں سال پہلے دنیا کی تخلیق کے متعلّق یہ نظریہ پیش کیا:

دنیا ایک چھوٹے سے ذرّے سے وجود میں آئی ہے اور وہ ذرّہ بھی دو متضاد قطبین سے مل کر بنا ہے۔ اِس طرح مادّہ وجود میں آیا اور پھر مادّے کی مختلف اقسام بن گئیں۔ یہ اقسام مادّے میں ذرّات کی کمی بیشی کا نتیجہ ہیں۔

امامؑ کی اِس تھیوری اور موجودہ ایٹمی تھیوری میں، جو دنیا کی تخلیق کے متعلّق ہے، ذرا بھی فرق نہیں پایا جاتا ہے اور یہ دو متضاد قطب ایٹم میں دو متضاد چارج، یعنی مثبت اور منفی ہیں اور یہی دو چارج ایٹم کی ساخت کا سبب ہیں۔ قدیم یونان اور اسکندریہ کے فلسفیوں اور سائنس دانوں نے اِس حقیقت کا سراغ لگایا تھا کہ کائنات میں اضداد کا وجود ہے اور اُن میں سے بعض کا کہنا تھا کہ ہر چیز کو اُس کی ضد سے پہچاننا چاہیے، لیکن آپ کی تھیوری ایک ایسی تھیوری ہے جس میں متضاد چیزوں کا ذکر نہایت وضاحت سے کیا گیا ہے۔ آپ کے نظریے میں ایسی صراحت ہے جو نہ تو یونان کے فلسفیوں کے نظریے میں پائی جاتی ہے اور نہ ہی

اسکندریہ کے سائنس دانوں کے نظریے میں ملتی ہے۔ یونان اور اسکندریہ کے فلسفیوں اور سائنس دانوں نے متضاد چیزوں کے بارے میں ایسے نظریات پیش کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے فرار کی راہ باقی رکھی ہے، یعنی اگر اُنھیں یہ معلوم ہو جائے کہ اُنھوں نے غلطی کی ہے تو وہ اپنے الفاظ واپس لے سکیں۔ یہ امر عیاں ہے کہ اُنھوں نے اپنے نظریات اِس لیے مبہم شکل میں پیش کیے ہیں کہ وہ خود اُن نظریات سے مطمئن نہیں تھے، لیکن آپ نے اپنا نظریہ صراحت سے بیان کیا ہے۔ آپ کی تھیوری میں 'چونکہ'، 'چنانچہ' اور 'اگر'، 'مگر' کی اصطلاحیں نہیں ہیں۔

عناصرِ اربعہ

حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام نے آج سے سیکڑوں سال پہلے، جب دنیا میں صرف چار عناصر ہوا، پانی، مٹی اور آگ کی موجودگی کا نظریہ رائج تھا، یہ نظریہ پیش کیا:

> ہوا ایک عنصر نہیں ہے، بلکہ کئی عناصر کا مرکّب ہے اور اِس میں ایسے اجزا ہوتے ہیں جن کی موجودگی سانس لینے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

جب اٹھارویں صدی عیسوی میں لودوازیہ نے آکسیجن کو ہوا میں شامل دوسری گیسوں سے جدا کیا اور بتایا کہ جو چیز جان داروں کے زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے، وہ آکسیجن ہے تو سائنس دانوں نے خیال کیا کہ ہوا میں شامل دوسری گیسیں زندگی کے لیے بے فائدہ ہیں۔ یہ نظریہ امامؑ کے نظریے 'ہوا کے تمام اجزا سانس لینے کے لیے ضروری ہیں' کے خلاف تھا، لیکن اُنیسویں صدی عیسوی میں سائنس دانوں نے سانس لینے کے حوالے سے آکسیجن کے بارے میں اپنے

نظریے کی تصحیح کر لی اور یہ تسلیم کر لیا کہ اگر چہ آکسیجن جان داروں کی زندگی کے لیے ضروری ہے اور خون کو جسم میں صاف کرتی ہے، لیکن جان دار خالص آکسیجن میں زیادہ عرصے سانس نہیں لے سکتے، کیونکہ اُن کے نظامِ تنفس کے خلیات کی تکسید (oxidation) شروع ہو جاتی ہے۔ دراصل آکسیجن خود نہیں جلتی، بلکہ جلنے میں مدد دیتی ہے اور جب ایسے جسم کے ساتھ، جو جلنے کے قابل ہوتا ہے، عمل کرتی ہے تو وہ جسم جلنے لگتا ہے اور جب کسی انسان یا جانور کے پھیپھڑوں کے خلیات ایک عرصے تک خالص آکسیجن میں سانس لیتے ہیں تو چونکہ گیسوں کا اُن کے ساتھ ردِ عمل (reaction) ہوتا ہے، اِس لیے پھیپھڑوں کے خلیات جلنے لگتے ہیں اور جس انسان یا جانور کے پھیپھڑے کے خلیات جل جائیں، وہ مر جاتا ہے، اِس لیے ضروری ہے کہ آکسیجن کے ساتھ دوسری گیسیں بھی انسانوں یا جانوروں کے پھیپھڑوں میں داخل ہوں۔ جب سائنس دانوں نے اپنے نظریے کی تصحیح کر لی تو ثابت ہو گیا کہ آپ کا نظریہ درست ہے اور وہ تمام گیسیں، جو ہوا میں پائی جاتی ہیں، سانس لینے کے لیے ضروری ہیں۔ مثال کے طور پر اوزون گیس ہی کو لے لیجیے، جس کی کیمیائی خصوصیات آکسیجن کے مانند ہیں اور اِس کا ہر سالمہ (molecule) آکسیجن کے تین ایٹموں سے مل کر بنتا ہے۔ بظاہر یہ گیس عملِ تنفس میں اِتنی اہم نہیں ہے، لیکن جب آکسیجن خون سے ملتی ہے تو یہ اُسے اِس دوران واپس باہر نہیں نکلنے دیتی ہے۔ ہوا میں موجود گیسوں میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ آکسیجن کو تہ میں نہیں بیٹھنے دیتیں۔ اگر اِس طرح ہوتا تو آکسیجن سطحِ زمین سے ایک خاص بلندی تک رہتی اور دوسری گیسیں، جو ہوا میں پائی جاتی ہیں، آکسیجن سے اوپر رہتیں، جس کے نتیجے میں تمام جان داروں کے اعضائے تنفس جل کر راکھ ہو جاتے اور زمین پر زندگی باقی نہ رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ

کے نظریے 'ہوا کے تمام اجزا سانس لینے کے لیے ضروری ہیں' کی اُنیسویں صدی عیسوی کے وسط سے لے کر آج تک تائید کی جا رہی ہے۔ آپ وہ پہلے انسان ہیں جنھوں نے عناصرِ اربعہ کے نظریے کو قابلِ اصلاح قرار دیا۔ آج ہمیں یہ عام سی بات محسوس ہوتی ہے، لیکن آٹھویں صدی عیسوی میں یہ ایک انقلابی نظریہ تھا اور اُس دور کے لوگوں کی عقلیں اِس حقیقت کو قبول نہیں کر سکتی تھیں کہ ہوا ایک عنصر نہیں ہے۔

سورج اور زمین کی گردش

حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا:

> زمین اپنے محور کے گرد گردش کرتی ہے اور دن اور رات کا باری باری آنا سورج کی زمین کے گرد گردش کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ خود زمین کی اپنے گرد گردش کی وجہ سے ہے۔ اِس طرح زمین کا آدھا حصّہ ہمیشہ تاریک اور آدھا حصّہ ہمیشہ روشن ہوتا ہے۔

پندرھویں، سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی کے سائنس دانوں نے ستاروں کے میکانکی قوانین کا ایک حصّہ دریافت کیا تھا، تاہم وہ یہ نہ جان سکے تھے کہ زمین اپنے محور کے گرد گردش کرتی ہے، لیکن امامؑ نے آٹھویں صدی عیسوی ہی میں یہ معلوم کر لیا تھا کہ زمین اپنے محور کے گرد گردش کرتی ہے اور اِسی گردش کے نتیجے میں دن اور رات وجود میں آتے ہیں۔ آج ہمیں معلوم ہے کہ نظامِ شمسی میں ایسا کوئی سیّارہ نہیں ہے جو محوری گردش نہ کر رہا ہو اور نظامِ شمسی کے تمام سیّاروں کی محوری گردش طبیعی قوانین کے عین مطابق ہے۔ سورج بھی، جو نظامِ

شمسی کا مرکز اور اِس نظام کو چلانے والا ہے، محوری گردش کر رہا ہے۔ اُس کی یہ محوری گردش خطِ اِستوا میں پچّیس دن اور رات میں مکمّل ہوتی ہے۔ آپ ستاروں کے میکانکی قوانین اور قوتِ جاذبہ سے بھی آگاہ تھے، یعنی آپ مرکز کی طرف مائل اور گریز کرنے والی قوتوں سے آشنا تھے۔ خیال رہے کہ مرکز کی طرف مائل کرنے والی قوت ہی کی وجہ سے سیّارے اپنے محور کے گرد گردش کرتے ہیں اور اِن قوتوں کا علم رکھے بغیر کوئی بھی انسان زمین کی اپنے محور کے گرد گردش کے متعلّق آگاہی حاصل نہیں کرسکتا۔

ستاروں کی روشنی

حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا:

> جو ستارے، ہم رات کو آسمان پر دیکھتے ہیں، اُن میں ایسے ستارے بھی ہیں جن کے نور کے مقابلے میں سورج کی روشنی ہیچ ہے۔

ستاروں کے متعلّق لوگوں کی محدود معلومات صدیوں تک اِس حقیقت کو سمجھنے میں رکاوٹ بنی رہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ امامؑ نے ستاروں کی روشنی کے متعلّق جو کچھ فرمایا ہے وہ عقل سے بعید اور نا قابلِ قبول ہے اور یہ محال نظر آتا ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے نورانی نقطے، جنھیں ستاروں کا نام دیا جاتا ہے، اِس قدر روشن ہوں کہ سورج اِن کے سامنے بے نور محسوس ہو، لیکن آج جدید تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ نے جو کچھ فرمایا تھا وہ درست ہے اور کائنات میں ایسے روشن ستارے موجود ہیں جن کے سامنے ہمارا سورج بے نور نظر آتا ہے۔ یہ روشن ستارے 'کوارز' (quars) کے نام سے موسوم ہیں۔ اِن میں سے بعض 'کوارز'

زمین سے نو ارب نوری سال کے فاصلے پر واقع ہیں اور بعض 'کوارز' کی روشنی ہمارے سورج کی روشنی سے دس ہزار ارب گنا ہے، لہٰذا ہم کسی مبالغہ آرائی کے بغیر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا سورج 'کوارز' کے مقابلے میں ایک بجھا ہوا چراغ ہے۔ پہلا 'کوارز' ۱۹۶۳ء میں دریافت ہوا تھا اور اب تک دو سَو سے زائد 'کوارز' دریافت ہو چکے ہیں۔ ہمارے سورج میں چوبیس گھنٹوں کے دوران جو روشنی پیدا ہوتی ہے، وہ چار سَو ارب ٹن ہائیڈروجن کے دھماکوں کے نتیجے میں وجود میں آتی ہے، لہٰذا اندازہ کیجیے کہ ایک 'کوارز' میں چوبیس گھنٹوں کے دوران سورج کی روشنی سے دس ہزار ارب گنا روشنی پیدا کرنے کے لیے کتنی ہائیڈروجن درکار ہوتی ہے۔

روشنی

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

روشنی چیز کی طرف سے انسانی آنکھوں میں آتی ہے۔ وہ روشنی جو اشیا سے ہماری آنکھوں کی طرف آتی ہے، اُس کا صرف کچھ حصّہ ہماری آنکھوں میں چمک پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے ہم دُور کی اشیا کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے۔ اگر وہ تمام روشنی جو ایک دُور کی چیز سے ہماری آنکھوں کی طرف آئے اور پتلی تک پہنچ پائے تو ہم دُور کی چیز کو قریب دیکھ سکیں گے اور اگر کوئی ایسا آلہ بنایا جائے جو ایک چیز سے خارج ہونے والی تمام روشنی کو آنکھوں کی پتلی تک پہنچا سکے تو ہم نہایت دُور سے بھی

اُس چیز کو آسانی سے دیکھ سکیں گے۔

امامؑ کی یہ تھیوری آپ کے شاگردوں کے ذریعے اردگرد کے علاقوں تک پہنچی اور جب صلیبی جنگوں کے دوران مشرق اور یورپ میں رابطہ بڑھا تو یہ تھیوری یورپ منتقل ہوگئی اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جانے لگی۔ برطانیہ کی آکسفورڈ یونیورسٹی کا مشہور اُستاد راجر بیکن بھی یہی تھیوری پڑھاتا تھا۔ سترھویں صدی عیسوی میں لیپرشی نے اِسی تھیوری کی روشنی میں دنیا کی پہلی دُوربین ایجاد کی اور پھر اُس دُوربین کو دیکھتے ہوئے گلیلیو نے فلکی دُوربین ایجاد کی۔ جب اُس نے پہلی مرتبہ اُس دُوربین سے چاند کا نظارہ کیا تو یہ دیکھ کر مبہوت رہ گیا کہ چاند میں بھی زمین کے مانند پہاڑوں کے سلسلے ہیں۔ اگر آپ یہ نظریہ پیش نہ کرتے تو کیا لیپرشی اور گلیلیو دُوربین ایجاد کرسکتے تھے؟ کیا گلیلیو نظامِ شمسی کے سیّاروں کا آسانی سے مشاہدہ کرسکتا تھا؟ اور کیا وہ اپنے مشاہدات کے ذریعے کوپرنیکس اور کیپلر کے مشہور نظریے 'نظامِ شمسی کے سیّارے زمین سمیت سورج کے گرد گھوم رہے ہیں' کی تصدیق کرسکتا تھا؟

آپ کی 'لائٹ تھیوری' میں ایک اَور نکتہ بھی غور طلب ہے، آپ نے فرمایا:

روشنی چیزوں سے انسانی آنکھوں کی طرف آتی ہے اور کسی روشن چیز کو دیکھنے کے لیے اُس کا روشن ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ خود روشن نہیں ہے تو کسی روشن چیز کی روشنی کا اُس پر پڑنا ضروری ہے تاکہ اُسے دیکھا جاسکے۔

آپ نے روشنی کی رفتار کے متعلّق بھی ایک ایسا نظریہ پیش کیا جو آپ کے دَور کے لحاظ سے توجّہ طلب ہے، آپ نے فرمایا:

روشنی نہایت تیزی سے ہماری آنکھوں کی طرف آتی ہے اور

یہ متحرک اشیا میں سے ہے۔
آپ کا یہ نظریہ روشنی کے جدید نظریے سے مطابقت رکھتا ہے۔

انسانی جسم کی ساخت

حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا:

وہ تمام اشیا جو مٹی میں پائی جاتی ہیں، انسانی جسم میں موجود ہیں، البتہ اُن کی مقدار ایک جیسی نہیں ہے۔ اُن میں سے بعض چیزیں انسانی جسم میں زیادہ ہیں اور بعض کم ہیں۔ انسانی جسم میں چار چیزیں زیادہ مقدار میں ہیں اور آٹھ چیزیں کم مقدار میں ہیں، جبکہ آٹھ چیزیں ایسی ہیں جو بہت ہی کم مقدار میں ہیں۔

اب تک زمین سے ایک سَو دو عناصر دریافت ہو چکے ہیں اور یہی عناصر انسانی جسم میں بھی موجود ہیں، لیکن انسانی جسم میں اِن میں سے بعض عناصر کی مقدار اِس قدر کم ہے کہ ابھی تک اُس مقدار کا تعیّن نہیں ہو سکا ہے۔ وہ آٹھ عناصر جو انسانی جسم میں بہت کم مقدار میں پائے جاتے ہیں، مولیڈن، ہیلیم، فلورین، کوبالٹ، مینگانیز، آیوڈین، زنک اور تانبا ہیں، اور وہ آٹھ عناصر جو انسانی جسم میں پہلے آٹھ عناصر سے زیادہ مقدار میں پائے جاتے ہیں، میگنیشیم، سوڈیم، پوٹاشیم، کیلشیم، فاسفورس، کلورین، سلفر اور لوہا ہیں، جبکہ وہ چار عناصر جو انسانی جسم میں زیادہ مقدار میں پائے جاتے ہیں، آکسیجن، کاربن، ہائیڈروجن اور نائیٹروجن ہیں۔ انسانی جسم میں اِن عناصر کی شناخت کوئی ایک دو دن کا کام نہ تھا، بلکہ اِس کام کا آغاز اٹھارویں صدی عیسوی میں پوسٹ مارٹم کے ذریعے ہوا۔

اِس کام کا سہرا آسٹرین اور فرانسیسی قوموں کے سر ہے۔ دوسرے ممالک میں پوسٹ مارٹم شاذ و نادر ہی کیا جاتا تھا۔ مشرقی ممالک میں تو پوسٹ مارٹم کا سرے سے رواج ہی نہ تھا اور یورپین ممالک میں آرتھوڈکس، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقے پوسٹ مارٹم کے شدید مخالف تھے۔ پوسٹ مارٹم کے ذریعے معلوم ہوا کہ تمام انسانوں میں، چاہے وہ سفید فام ہوں، سیاہ فام ہوں، ریڈ انڈین ہوں یا دوسری مخلوط نسلوں کے ہوں، چار عناصر کی مقدار دوسرے عناصر سے زیادہ ہوتی ہے۔ اِس کے علاوہ آٹھ عناصر کی مقدار مذکورہ چار عناصر سے کم ہوتی ہے اور دوسرے آٹھ عناصر کی مقدار مزید کم ہوتی ہے۔ یہ تناسب تمام صحت مند انسانوں میں برابر ہوتا ہے، چاہے وہ قطبی علاقوں کے باسی ہوں یا اِستوائی علاقوں کے باشندے ہوں، بشرطیکہ اُن کی عمر اور وزن برابر ہو۔ یوں صدیوں کے تجربات اور تحقیقات نے آج یہ ثابت کر دیا ہے کہ امامؑ کا انسانی جسم کی ساخت کا نظریہ درست ہے۔

امراض کے اسباب

حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا:

بعض شعاعیں ایسی ہیں جو اگر ایک بیمار شخص سے ایک
تندرست شخص پر پڑیں تو ممکن ہے کہ اُسے بیمار کر دیں۔

خیال رہے کہ آب و ہوا یا جراثیم کے منتقل ہونے کے متعلق بات نہیں ہو رہی ہے، بلکہ شعاعوں کے متعلق بات ہو رہی ہے اور وہ بھی تمام شعاعوں کے متعلق نہیں، بلکہ صرف چند اقسام کی شعاعوں کے متعلق جو اگر ایک بیمار شخص سے ایک تندرست شخص پر پڑیں تو ممکن ہے کہ اُسے بیمار کر دیں۔

بیکٹیریا اور وائرس کی شناخت سے قبل یہ خیال کیا جاتا تھا کہ بیماریوں کے منتقل ہونے کا سبب بُو ہے، چنانچہ بیماریوں کو پھیلنے سے روکنے کے لیے تمام اقدامات بُو کو روکنے کے ذریعے انجام پاتے تھے تاکہ ایک بیمار شخص کی بیماری بُو کے ذریعے ایک تندرست شخص تک نہ پہنچے اور اُسے بیمار نہ کرے۔ کسی نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ بعض شعاعیں ایسی ہیں جو اگر ایک بیمار شخص سے ایک تندرست شخص پر پڑیں تو اُسے بیمار کر دیتی ہیں۔ روس میں پہلی مرتبہ اِس حقیقت کا کھوج لگایا گیا اور اُس کے ایک بڑے علمی مرکز نووسائبیرسک میں سائنس دانوں نے متعدد تجربات سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ پہلے بیمار شخص کے خلیات سے شعاعیں نکلتی ہیں اور پھر جونہی یہ شعاعیں تندرست شخص کے خلیات پر پڑتی ہیں تو اُسے بیمار کر دیتی ہیں، اگرچہ بیمار شخص کے خلیات اور تندرست شخص کے خلیات کے درمیان معمولی سا رابطہ بھی نہ ہو۔ اِن سائنس دانوں کی تحقیقات سے یہ نتیجہ نکلا کہ ہمارے جسم کے خلیات میں سے ہر ایک خلیہ شعاعیں خارج کرنے والا اور شعاعیں وصول کرنے والا ہے۔ اگر ایک صحت مند خلیہ ایک بیمار خلیے سے خارج ہونے والی الٹرا وائلٹ شعاعوں (ultra voilet rays) کو وصول کر لے تو وہ صحت مند خلیہ بھی بیمار ہو جائے گا۔ اب متعدد تجربات کی روشنی میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ اگر کچھ صحت مند خلیات ٹاکسن (toxin) کے اثر سے بیمار ہو جائیں اور الٹرا وائلٹ شعاعیں خارج کریں تو یہ شعاعیں اُن صحت مند خلیات کو بھی بیمار کر دیتی ہیں جن کا اُن سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔ اِن سائنس دانوں نے یہ معلوم کر لیا ہے کہ اگر خلیات کا ایک گروہ چند بیماریوں میں مبتلا ہو جائے تو اُن میں سے ہر بیماری ایک مخصوص قسم کی فوٹان (photon) خارج کرتی ہے۔ یہ سائنس دان اب اِن فوٹانز کی جدوَل تیار کرنے میں مشغول ہیں جو بیمار خلیات

مختلف قسم کی بیماریوں کی وجہ سے خارج کرتے ہیں۔ چونکہ بیکٹیریا، وائرس اور ٹاکسن کے ذریعے پھیلنے والی بیماریاں کوئی ایک دو نہیں ہیں، لہٰذا اِس جدوَل کے تیار کرنے میں ایک عرصہ لگ سکتا ہے، البتہ جدوَل کی تیاری کے دوران کئی بیماریوں کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر جب یہ معلوم ہو جائے گا کہ انفلوئنزا کے وائرس سے بیمار ہونے والے خلیات کون سی شعاعیں خارج کرتے ہیں اور اُن کی مقدار، حجم اور طوالت کتنی ہے تو انفلوئنزا کے علاج معالجے اور صحت مند خلیات کو بیمار ہونے سے روکنے کے سلسلے میں اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔ اِس سلسلے میں امریکا میں بھی تحقیقات ہوئی ہیں اور جو نتائج حاصل ہوئے ہیں، وہ روسی سائنس دانوں کے نتائج سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ نتائج امریکا کے کئی ریسرچ میگزینز میں شائع ہو چکے ہیں۔ اِس موضوع پر ایک امریکی محقق نے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ یوں آٹھویں صدی عیسوی میں امامؑ کا پیش کیا ہوا امراض کے اسباب کا نظریہ آج ایک حقیقت ثابت ہو چکا ہے۔

اضداد

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

خدا کے علاوہ جتنے وجود اِس کائنات میں پائے جاتے ہیں، اُن کی ضد بھی موجود ہے، لیکن اِن اضداد میں تصادم رُونما نہیں ہوتا۔ اگر تصادم وجود میں آ جائے تو بعید نہیں کہ یہ کائنات ویران ہو جائے۔

امامؑ کا یہ نظریہ آج کے 'مادّہ وضدِ مادّہ' کے نظریے سے ملتا جلتا ہے اور تھیوری کے مرحلے سے گزر کر عملی مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔ مختلف ممالک کے سائنس

دان عناصر کے ضدِ مادّہ کو دریافت کرنے میں مصروف ہیں۔ مادّے اور ضدِ مادّہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ عناصر کے مادّے کے ایٹموں میں الیکٹران پر منفی اور پروٹان پر مثبت برقی بار ہوتا ہے۔ ابھی تک کسی نے تجربہ نہیں کیا کہ اگر مادّے کے ایٹم ضدِ مادّہ کے ایٹموں سے متصادم ہوں اور دھماکا ہو جائے تو کیا ہوگا۔ اِس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ تھیوری کی حد تک محدود ہے اور ایسا ہی ہے جیسا ۱۹۴۴ء سے پہلے یورینیم کے ایٹموں کے دھماکے کے بارے میں کہا جاتا تھا۔ اُس وقت تک امریکا نے ایٹمی تجربہ نہیں کیا تھا اور سائنس دان کہتے تھے کہ ایٹمی تجربہ کرۂ ارض کو تباہ کر دے گا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اُس کے بعد کئی مرتبہ ایٹم اور ہائیڈروجن کے دھماکے ہو چکے ہیں، لیکن کرۂ ارض دھماکے کا شکار نہیں ہوا۔ ایٹم بم کے دھماکے اور مادّے اور ضدِ مادّہ کے دھماکے میں فرق پایا جاتا ہے، کیونکہ ایٹم بم یا ہائیڈروجن بم پھٹتا ہے تو مادّے کا کچھ حصّہ توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور زیادہ حصّہ بیکار رہ جاتا ہے۔ جو کچھ ایک ایٹم بم یا ہائیڈروجن بم میں ہے، اگر وہ سب کچھ توانائی میں تبدیل ہو جائے تو بہت زیادہ توانائی وجود میں آتی ہے۔ ۱۹۴۵ء میں ہیروشیما پر جو بم گرایا گیا تھا، اُس کی کمیّت کے ہزار حصّوں میں سے صرف اُنیس حصّے توانائی میں تبدیل ہوئے تھے، جبکہ باقی ضائع ہو گئے تھے۔ مشہور ماہرِ طبیعیات آئن سٹائن نے مادّے کو توانائی میں تبدیل کرنے کے قانون کے ذریعے اِس امر کی نشاندہی کی تھی کہ اگر ایک کلوگرام مادّہ مکمّل طور پر توانائی میں تبدیل ہو جائے تو بھی کرۂ ارض تباہ نہیں ہوگا۔ یہ دراصل اُس تھیوری کی نفی تھی جو برطانیہ کے ماہرِ طبیعیات جول نے پیش کی تھی۔ اُس کا کہنا تھا کہ اگر ایک کلوگرام مادّہ مکمّل طور پر توانائی میں تبدیل ہو جائے تو کرۂ ارض تباہ ہو جائے گا۔ آج بھی جب فزکس میں 'مادّہ اور ضدِ مادّہ' کی بحث سامنے آتی ہے تو ماہرینِ طبیعیات کہتے

ہیں کہ مادّے اور ضدِ مادّہ کا ٹکراؤ دونوں کو مکمّل طور پر توانائی میں تبدیل کر دے گا۔ اِن ماہرین کے مطابق ایک کلوگرام مادّے کے ایک کلوگرام ضدِ مادّہ میں تبدیل ہونے سے اِس قدر توانائی وجود میں آئے گی کہ کرۂ ارض تباہ ہو کر گیس میں تبدیل ہو جائے گا۔ چونکہ اِس گیس کی حرارت بہت زیادہ ہوگی، لہٰذا یہ سورج تک پھیل جائے گی، لیکن سویڈن کی لونڈ یونیورسٹی کا مشہور اُستاد آلفن اِس نظریے کا مخالف ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ آئندہ انسان کی توانائی کا منبع یورینیم اور ہائیڈروجن کا استعمال نہیں ہوگا، بلکہ وہ مادّے اور ضدِ مادّہ کے تصادم سے حاصل ہونے والی توانائی استعمال کرے گا اور پچاس کلوگرام مادّہ اور پچاس کلوگرام ضدِ مادّہ تمام دنیا میں انسان کی توانائی کی سالانہ ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہوگا۔

ابھی تک مادّے اور ضدِ مادّہ کو آپس میں ٹکرایا نہیں گیا جس سے یہ معلوم ہو سکتا کہ کیا چیز حاصل ہوتی ہے، لیکن آلفن کی تھیوری کے مطابق توانائی کے علاوہ کوئی ایسی چیز وجود میں آئے گی جو ماحول کو آلودہ کر دے گی۔ اُس نے مادّے اور ضدِ مادّہ کے تصادم سے وجود میں آنے والی توانائی کو 'میٹر جی' کا نام دیا ہے، جبکہ عام توانائی کو 'انرجی' کہا جاتا ہے۔ اِس نظریے کے مطابق اگر آدھا کلوگرام مادّہ اور آدھا کلوگرام ضدِ مادّہ متصادم ہوں تو ایک ارب درجہ فارن ہائٹ حرارت وجود میں آئے گی اور دنیا میں کوئی ایسا منبع نہیں ہے جو اِتنی حرارت پیدا کر سکے۔ ماہرینِ طبیعیات کے مطابق سورج کے مرکز کا درجۂ حرارت دس ملین درجے ہے۔ کیا انسان اِتنی زیادہ حرارت کو قابو میں لا کر اپنے کسی کام میں لا سکتا ہے؟ آلفن کا کہنا ہے کہ ہاں، مادّے اور ضدِ مادّہ کے نامکمّل دھماکے سے درجۂ حرارت میں کمی لائی جا سکتی ہے۔ نامکمّل دھماکوں سے مراد ایٹم بم کا دھماکا ہے جس میں مادّے کا صرف تھوڑا سا حصّہ توانائی میں تبدیل ہوتا ہے۔

جس طرح ایٹمی توانائی حاصل کرنے کے لیے تمام عناصر میں سے یورینیم کا انتخاب کیا گیا تھا، اِسی طرح خیال کیا جاتا ہے کہ مادّے اور ضدِ مادّہ کے دھماکے سے توانائی حاصل کرنے کے لیے ہیلیم کے عنصر کو استعمال میں لایا جائے گا، کیونکہ روسی ماہرینِ طبیعیات نے ہیلیم کا ضدِ مادّہ حاصل کرلیا ہے اور دونوں کے دھماکے کی تیاری کررہے ہیں۔

انسان کی عمر

حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا:

> انسان اِس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ لمبی عمر گزارے۔ وہ اپنی عمر خود کم کرتا ہے۔ اگر وہ اسلامی قوانین پر عمل کرے، ممنوعہ چیزوں سے دُور رہے اور کھانے پینے میں قرآنی احکام کے مطابق عمل کرے تو لمبی عمر پائے گا۔ انسانی عمر کی طوالت کا مسئلہ دو چیزوں سے وابستہ ہے، ایک صحت کا خیال رکھنا اور دوسرے بسیار خوری سے پرہیز کرنا۔

آج یورپی ممالک میں صحت کی بہتری کی وجہ سے دنیا میں آنے والے ہر بچّے کی اوسط عمر ستّر سال متوقّع ہوتی ہے۔ اگر کینسر قابلِ علاج ہوجائے اور دل و دماغ کے دَوروں اور خون کی مہلک بیماریوں پر قابو پالیا جائے تو کیا انسان کی اوسط عمر بہت زیادہ بڑھ جائے گی؟ ماہرین کا تجزیہ اور اعداد و شمار اِس سوال کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ جب کینسر قابلِ علاج ہوجائے گا اور دل و دماغ کے دَوروں اور خون کی مہلک بیماریوں پر قابو پالیا جائے گا تو بھی انسان کی عمر میں اوسطاً صرف دو سال کا اضافہ ہوگا۔ دراصل جو چیز اوسط عمر کو بڑھاتی ہے وہ چند بیماریوں کا علاج نہیں

ہے، بلکہ کھانے پینے کی تمام چیزوں سمیت صحت کے اصولوں کا خیال رکھنا ہے۔ جب انسان تمام بیماریوں کے علاج پر قادر ہوگا تو بھی بڑھاپے سے مرنے سے نہیں بچ سکے گا۔ انسانی تدبیر بڑھاپے پر قابو نہیں پا سکتی، البتہ اُسے تاخیر میں ڈال سکتی ہے۔ یہ تدبیر آلودگی سے پاک ماحول اور متوازن غذاؤں میں مضمر ہے۔

ماحول کی آلودگی کے علاوہ جو چیز انسان کی عمر کو کم کرنے کا سبب بنتی ہے، وہ آواز ہے۔ تیز، چبھنے والی اور خراش دار آوازوں کے اثرات بھی اُسی قدر مضر اور نقصان دہ ہیں جس قدر آلودگی کے دوسرے محرکات ہیں۔ انسان یہ آوازیں سننے اور برداشت کرنے کا عادی تو ہو جاتا ہے، لیکن یہ آوازیں اُس کے اعصاب کو نقصان پہنچاتی ہیں اور اُس کی عمر میں کمی لاتی ہیں۔ جس طرح آکسیجن لوہے کو زنگ آلود کر دیتی ہے، اُسی طرح تیز آوازیں انسان کے خلیات کو فرسودہ کر دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں اب آوازوں کو جذب کرنے والی دیواروں پر مشتمل گھروں اور دفتروں کی تعمیر پر زور دیا جا رہا ہے۔

غیر متوازن خوراک بھی انسان کی عمر میں کمی لانے والے عوامل میں سے ایک ہے۔ دَورِ جدید نے انسان کو ایسے طرزِ حیات کا عادی بنا دیا ہے جس میں زیادہ تر غیر فطری غذاؤں کا استعمال رائج ہو چکا ہے۔ دنیا کے مختلف خطّوں میں آج بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو اچھی غذا کھاتے ہیں اور جسمانی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں، چنانچہ اُن کی جوانی کی طاقت اوسطاً اَسّی یا پچاسی سال تک برقرار رہتی ہے، لیکن دَورِ جدید کی آسائشوں میں رہنے والے اور غیر فطری غذائیں کھانے والے افراد جونہی پچاس سال کی عمر کو پہنچتے ہیں تو ناقص غذاؤں سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور پٹھوں، ہڈّیوں اور خون کی بیماریاں اُنھیں بہت جلد موت کی وادی میں دھکیل دیتی ہیں۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ انسان کو لمبی عمر گزارنے اور ہمیشہ صحت مند رہنے کے لیے زیادہ تر نباتاتی غذائیں کھانی چاہییں۔ خصوصاً جوانی کے بعد چربی والے گوشت سے پرہیز کرنا چاہیے۔ تیس سال کی عمر کے بعد بہترین غذا سبزیاں اور پھل ہیں، لیکن مشاہدات ثابت کرتے ہیں کہ طوالتِ عمر کے لیے ضروری نہیں ہے کہ انسان سبزیاں اور پھل ہی کھائے۔ آب وہوا کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ کچھ علاقوں میں گوشت، مچھلی اور دودھ بھی طویل عمر کا سبب بنتے ہیں۔

مذکورۂ بالا عوامل اور اسباب کے پس منظر میں یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ امامؑ نے درست فرمایا تھا کہ انسان اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ لمبی عمر گزارے۔ وہ اپنی عمر خود کم کرتا ہے۔

ماں کی گود

حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا:

مائیں اپنے شیر خوار بچوں کو اپنے بائیں طرف سلایا کریں۔

امامؑ کی اِس نصیحت کو صدیوں تک بے معنی اور فضول سمجھا جاتا رہا۔ لوگ کہتے تھے کہ دائیں اور بائیں میں کوئی فرق نہیں ہے، ماں اپنی سہولت کے مطابق جس طرف چاہے بچے کو سلائے۔

گزشتہ صدی کی دوسری دہائی میں امریکا کی کورنیل یونیورسٹی میں نومولود اور شیر خوار بچوں پر تحقیق کا کام شروع ہوا۔ دنیا میں کوئی اَور علمی مرکز نہیں ہے جہاں اِس یونیورسٹی کی طرح نومولود اور شیر خوار بچوں کے بارے میں اِس طرح کی تحقیق کی گئی ہو، یہاں تک کہ اشتہارات اور سائن بورڈوں کو بھی تحقیق میں شامل کیا گیا۔ اِس حوالے سے کام کرتے ہوئے ماہرین نے نوٹ کیا کہ نومولود

بچّوں کے متعلق دنیا بھر سے جمع کیے گئے چار سَو چھیاسٹھ سائن بورڈوں میں سے تین سَو تہتر سائن بورڈوں میں ماؤں نے اپنے بچّوں کو اپنی بائیں جانب رکھا ہوا تھا، چنانچہ اِس دلچسپ اتّفاق پر سنجیدگی سے کام شروع ہوا۔ طویل عرصے میں مرتّب ہونے والی رپورٹوں کے مطابق پیدائش کے بعد جب نومولود بچّے کو ماں کی بائیں جانب سلایا جاتا ہے تو وہ پُرسکون رہتا ہے، لیکن جب اُسے دائیں طرف سلایا جاتا ہے تو وہ مضطرب ہو جاتا ہے۔ ماہرین نے متعدّد تجربات سے یہ نتائج اخذ کیے کہ بچّہ ماں کے شکم میں ماں کے دل کی دھڑکنوں سے مانوس ہو جاتا ہے۔ ماں کے دل کی دھڑکنیں سننے کی جو عادت اُسے پیدائش سے پہلے ہوتی ہے وہ اُس میں اِس قدر نفوذ کر جاتی ہے کہ پیدائش کے بعد اگر وہ اُن دھڑکنوں کو نہ سنے تو پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ اُن دھڑکنوں کو خوب پہچانتا ہے، لہٰذا جس وقت اُسے ماں کی بائیں جانب سلایا جائے تو وہ اُن دھڑکنوں کو سن کر پُرسکون رہتا ہے۔ چونکہ دائیں جانب یہ دھڑکنیں سنائی نہیں دیتیں، لہٰذا اگر اُسے دائیں جانب سلایا جائے تو وہ مضطرب ہو جاتا ہے۔

کورنیل یونیورسٹی میں اِس سلسلے میں نہایت دلچسپ تجربات کیے گئے جو امامؒ کی نصیحت کی افادیت اور نومولود بچّوں کی نفسیات کے مظہر ہیں۔ ایک بالغ انسان کا دل، چاہے مرد کا ہو یا عورت کا، عموماً ایک منٹ میں بہتر بار دھڑکتا ہے۔ یونیورسٹی کے ایک کمرے میں ماں کے دل کی دھڑکنوں جیسی آواز پیدا کرنے والی ایک مشین اور چند نومولود بچّے رکھے گئے۔ اُس کمرے میں اگر ماں کے دل کی مصنوعی دھڑکنوں کی تعداد ایک سَو دس سے ایک سَو بیس کی جاتی تو تمام بچّے رونے لگتے، چنانچہ ماہرین نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ماں کے دل کی مصنوعی دھڑکنیں بھی فی منٹ بہتر ہونی چاہئیں۔ ایک اَور تجربے میں کچھ نومولود بچّوں کو ایک ایسے کمرے

میں رکھا گیا جہاں وہ ماں کے دل کی مصنوعی دھڑکنیں سن سکتے تھے اور کچھ نومولود بچّوں کو ایک ایسے کمرے میں رکھا گیا جہاں وہ یہ دھڑکنیں نہیں سن سکتے تھے۔ دونوں کمروں والے بچّوں کی غذا ایک جیسی تھی، لیکن دیکھنے میں آیا کہ اُس کمرے کے بچّے، جہاں ماں کے دل کی مصنوعی دھڑکنیں سنائی دیتی تھیں، زیادہ بھوک کا اظہار کرتے تھے، جبکہ اِس کے برعکس دوسرے کمرے والے بچّے کم بھوک کا اظہار کرتے تھے۔ اِسی طرح ایک اَور تجربے میں مصنوعی دھڑکنوں کی شدّت کے لحاظ سے بھی تحقیق کی گئی اور دیکھا گیا کہ اگر یہ دھڑکنیں ماں کے دل کی دھڑکنوں کی آواز سے زیادہ شدید ہوں تو بچّے مضطرب ہو کر رونے لگتے ہیں۔ اِسی طرح کے دیگر تجربات اور ماؤں کے طرزِ عمل کے مشاہدات نے آج یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ نے درست فرمایا تھا کہ مائیں اپنے شیر خوار بچّوں کو اپنے بائیں طرف سلایا کریں۔

ماحول کی آلودگی

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

> آدمی کو اِس طرح زندگی گزارنی چاہیے کہ اُس کا ماحول آلودہ نہ ہو۔ اگر اُس کا ماحول آلودہ ہو گیا تو ایک دن ایسا آئے گا کہ اُس کے لیے زندگی گزارنا مشکل، بلکہ شاید ناممکن ہو جائے گا۔

امامؑ کے دَور میں صنعتیں دستی آلات تک محدود تھیں اور دھاتوں کو آگ کی چھوٹی چھوٹی بھٹیوں میں پگھلایا جاتا تھا، حتّٰی کہ لوہے کو بھی لکڑی کی آگ سے پگھلایا جاتا تھا۔ اگر کبھی لوہے کو پتھر کے کوئلے سے بھی پگھلاتے تھے تو اِتنے کوئلے نہیں جلاتے تھے کہ ماحول آلودہ ہو جائے۔ صنعتی انقلاب کے بعد بھی جرمنی، فرانس،

برطانیہ اور تمام یورپی ممالک میں لوہے کو کافی مقدار میں کام میں لایا جاتا تھا، لیکن ماحول میں آلودگی نہیں پائی جاتی تھی۔

ماحول کی آلودگی کا مسئلہ نصف صدی پہلے تک موجود نہ تھا۔ یہ مسئلہ اُس وقت سامنے آیا جب پہلا ایٹم بم پھٹا اور اُس نے فضا کو آلودہ کیا۔ اگر مزید دھماکے نہ کیے جاتے تو شاید ماحول آلودہ نہ ہوتا، لیکن ایٹمی طاقتوں نے بعد میں بھی یہ تجربات جاری رکھے اور اِس دوران ایٹمی بجلی گھر بھی چلانے شروع کر دیے۔ یوں فضا کی آلودگی آہستہ آہستہ بڑھ گئی۔ اِسی دوران ایسی صنعتوں کو فروغ ملا جن کا فضلہ پانی اور ہوا کو بُری طرح آلودہ کرنے لگا۔ شمالی امریکا کے بڑے بڑے دریاؤں میں مچھلی کی نسل تقریباً ناپید ہوگئی۔ اِس سے بھی زیادہ خطرناک آلودگی سمندروں کی ہے، کیونکہ سمندروں میں پلانکٹن خلیات والے جان دار پائے جاتے ہیں جو کرۂ ارض کی نوّے فی صد آکسیجن تیار کرتے ہیں۔ یہ جان دار اب آلودگی کی وجہ سے مر رہے ہیں اور اِس کے نتیجے میں کرۂ ارض کی آکسیجن کی مقدار میں مسلسل کمی ہورہی ہے۔ اگر یہ صورتِ حال برقرار رہی تو آئندہ پچاس برسوں میں آکسیجن کی مقدار آدھی رہ جائے گی اور انسانوں اور جانوروں کے سانس لینے کی کیفیت بہت کربناک ہوجائے گی۔

ماحول کو آلودہ کرنے والی چیزوں میں سے ایک یورینیم اور پلاٹینم کے ایٹموں کی افزودگی بھی ہے۔ اُس سے ایسا مواد خارج ہوتا ہے جو ماحول میں پھیل کر آلودگی کا سبب بنتا ہے۔ ایٹمی بجلی گھر مسلسل اِس مواد کو خارج کررہے ہیں۔ صنعتی ترقّی میں سرِفہرست ملک جاپان کا یہ حال ہے کہ ماحول کی آلودگی کی وجہ سے وہاں ایسے ایسے امراض نے جنم لیا ہے جن کا علمِ طب کی تاریخ میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔ یہی حال دیگر صنعتی ممالک کا ہے۔ صورتِ حال کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے اِن ممالک نے

آلودگی پیدا کرنے والے فضلے اور کیمیائی مواد سے نجات حاصل کرنے کی کوششیں شروع کردی ہیں۔ اِن ممالک نے آلودگی کے مضمرات سے دوچار ہونے کے بعد اُس کے تدارک پر توجہ دینا شروع کی ہے، جبکہ آپ نے سیکڑوں سال پہلے فرمادیا تھا کہ آدمی کو اِس طرح زندگی گزارنی چاہیے کہ اُس کا ماحول آلودہ نہ ہو۔

قوانین فطرت

حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا:

جب لوگ دنیا کے حالات میں بدنظمی پائیں اور مشاہدہ کریں کہ اچانک طوفان آ گیا ہے، سیلاب آ گیا ہے یا زلزلہ گھروں کو برباد کر رہا ہے تو اِن باتوں کو دنیا کی بدنظمی پر محمول نہ کریں اور اِس بات سے آگاہ رہیں کہ یہ غیر متوقع واقعات ایک یا کئی مستقل اور نا قابلِ تغیر قواعد کی اطاعت کا نتیجہ ہیں۔ اِن قواعد سے ثابت ہے کہ مذکورہ واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

آج ماہرینِ طبیعیات اِس امر پر متفق ہیں کہ طوفانوں کا آنا اور آتش فشاں پہاڑوں کا پھٹنا غیر معمولی واقعات نہیں ہیں، بلکہ فطری قوانین کے تابع ہیں۔ دنیا کے قواعد کے مستقل اور نا قابلِ تغیر ہونے کی تائید تمام فلاسفہ کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ انسان کو جو تبدیلیاں نظر آتی ہیں، وہ اُس کی نظر اور عقل کا دھوکا ہے، جبکہ خدا کے نزدیک دنیا کی کسی چیز میں کوئی تبدیلی وجود میں نہیں آتی۔ وہ دانائے مطلق ہے اور اُس نے جو بھی قانون بنایا ہے، وہ ابدی ہے۔ انسان یہ پیشگوئی نہیں کرسکتا کہ پچاس سال بعد اُس کی اجتماعی یا انفرادی حالت کیا ہوگی؟ وہ قوانین صرف موجودہ

دور کے لیے بناتا ہے اور جب پچاس سال بعد دنیا کے حالات بدلتے ہیں تو وہ بھی قوانین کو تبدیل کر دیتا ہے، لیکن خدا نے کائنات کے تمام قوانین ہمیشہ کے لیے بنائے ہیں۔ اُس نے ایسے قوانین وضع کیے ہیں جنھیں تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔ کائنات اِس قدر وسیع، مضبوط اور مستقل قوانین کی حامل ہے کہ اگر اِس میں ایک طرف کوئی ایک سورج تباہ ہو جائے تو قریب ترین ستاروں پر بھی کوئی ناخوش گوار اثر نہیں پڑے گا، چہ جائیکہ دُور دَراز واقع ستاروں پر اثر پڑے۔ گویا کائنات میں لاگو قوانین مستقل ہیں اور بعض سورجوں کا تباہ ہونا اِنھی قوانین کے تحت ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے پہلے نصف میں سائنس دانوں نے چھوٹی دنیا، یعنی ذرّے کی دنیا کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو معلوم ہوا کہ ذرّے کے اندر ایسے قوانین کارفرما ہیں جو ہمیشہ لاگو رہتے ہیں۔ ایٹم میں پایا جانے والا الیکٹران فی سیکنڈ تین کیٹریلین مرتبہ ایٹم کے گرد چکّر لگاتا رہتا ہے اور کوئی واقعہ اِس گردش کو نہیں روکتا۔ لوہے کے ایک ذرّے میں بھی الیکٹران کی گردش مذکورہ رفتار سے جاری رہتی ہے، چاہے ہم اُسے پگھلا دیں، یہاں تک کہ اگر اُسے اِس قدر گرم کیا جائے کہ وہ گیس میں تبدیل ہو جائے تو بھی ایٹم کے مرکز کے گرد الیکٹران کی رفتار وہی رہتی ہے۔ اِس دائمی حرکت میں خلل ڈالنے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ ایٹم کی توڑ پھوڑ کی جائے۔ اِس طرح الیکٹران مرکز سے دُور ہٹ جائے گا، لیکن اِس صورت میں بھی اُس کی حرکت ختم نہیں ہوگی، بلکہ وہ کسی دوسرے مرکز کے گرد گھومنا شروع کر دے گا۔

ماہرینِ طبیعیات کہتے ہیں کہ کائنات میں ایک چیز تبدیل نہیں ہوتی اور وہ ہے قانونِ فطرت۔ اِس سے مراد یہ ہے کہ نہ صرف اِس زمین پر اور نہ صرف اِس نظامِ شمسی میں، بلکہ ساری کائنات میں قدرت کے قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں

آ سکتی۔ فزکس کہتی ہے کہ کوئی چیز ختم نہیں ہوتی، بلکہ اُس میں صرف تبدیلی رُونما ہوتی ہے، لہٰذا دنیا ہرگز ختم نہیں ہوگی، چہ جائیکہ اِس پر حاکم قوانین کا خاتمہ ہو۔ اِس طرح جدید سائنس امامؑ کے اِس نظریے کی تصدیق کرتی ہے کہ دنیا کے قواعد مستقل اور ناقابلِ تغیر ہیں۔

حرکتِ اشیا

حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا:

جو کچھ موجود ہے، حرکت کر رہا ہے، حتّٰی کہ جمادات بھی متحرّک ہیں۔ اگرچہ ہماری آنکھیں اُن کی حرکات کو نہیں دیکھ سکتیں، لیکن کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو متحرّک نہ ہو۔

امامؑ کے دَور میں یہ بات قابلِ قبول نہیں تھی، لیکن آج ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے اور کائنات میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو متحرّک نہ ہو۔ سائنس یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ کیا حرکت کے بغیر بھی کسی چیز کا وجود ہوسکتا ہے۔ تصوّر کی بھی کوئی طاقت کسی ساکن چیز کا اتا پتا نہیں بتا سکتی، کیونکہ جونہی حرکت رُکی، تصوّر کی وہ طاقت، جسے حرکت کو فرض کرنا تھا، ختم ہوگئی۔ جس لمحے حرکت رُک جاتی ہے، انسان مرجاتا ہے۔ آپ نے آٹھویں صدی عیسوی ہی میں یہ حقیقت بیان کردی تھی کہ جس لمحے حرکت رُک جاتی ہے، انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے، لیکن موت کے بعد بھی ایک دوسری سمت سے حرکت جاری رہتی ہے، ورنہ انسان کا جسم خراب نہ ہو۔ ہر ساکن جسم میں دو قسم کی دائمی حرکت موجود ہوتی ہے۔ پہلی حرکت ایٹم کے اندر ہے، الیکٹران ایٹم کے مرکز کے گرد ایک سیکنڈ میں تین کیٹریلین مرتبہ چکّر لگاتا ہے۔ دوسری حرکت مالیکیولوں کا دائمی ارتعاش ہے، ہر جسم کے مالیکیول، چاہے

سردی ہو یا گرمی، صفر سے دس کیٹریلین مرتبہ فی سیکنڈ حرکت کرتے ہیں۔ یہ واضح ہے کہ جب الیکٹران سے شعاع نکلتی ہے تو وہ اُس وقت تک خطِ مستقیم میں رہتی ہے جب تک اُس کے راستے میں مقناطیسی قوت حائل نہ ہو، کیونکہ یہ قوت اُسے اطراف میں منتشر کر دیتی ہے۔ ہم الیکٹرانوں کی ایک ہی سمت میں حرکت کو قطب نما کی سوئی کے ذریعے محسوس کر سکتے ہیں جو ہمیشہ شمال کی جانب رہتی ہے۔

موجودہ دَور کے ماہرینِ فلکیات بھی کائنات کے بارے میں ایسا نظریہ رکھتے ہیں، جس سے آپ کے اِس نظریے کی تصدیق ہوتی ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے، اُسے خالق کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اُنیسویں صدی عیسوی سے کائنات کی صورت و حرکت کی وضاحت پر توجہ دی گئی ہے اور اِس ضمن میں متعدّد نظریات پیش کیے گئے ہیں، لیکن یہ تمام نظریات تھیوری کی حد تک محدود ہیں۔ علمِ کائنات میں بعض قوانین، مثلاً قوتِ تجاذب کے قانون، سورج کے گرد سیّاروں کے گھومنے کے قانون اور آزاد اجسام کے گرنے کے قانون پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ یہ تمام قوانین اُنیسویں صدی عیسوی سے پہلے دریافت ہو چکے تھے۔ جب سے ریڈیو ٹیلی اسکوپ نے انسانی بینائی کو وسعت دی ہے، ماہرینِ فلکیات پر یہ نئی حقیقت آشکار ہوئی ہے کہ کہکشاں کے مانند بعض بڑے اجسام تیزی سے حرکت کرتے ہوئے ایک نقطے کی سمت جا رہے ہیں۔ یہ اجرامِ فلکی خلا میں جہاں کہیں بھی حرکت کر رہے ہیں، اِن کی حرکت کا رُخ اِس امر کی نشاندہی کر رہا ہے کہ یہ ایک مرکز کی طرف جا رہے ہیں۔ جس کہکشاں میں ہمارا سورج واقع ہے وہ اور دوسری کہکشائیں بھی نہایت سُست رفتاری سے اُسی مرکز کی طرف رواں دواں ہیں۔ اگر اِس نظریے کی تائید کی جائے تو اِس نظریے اور آپ کے نظریے میں لفظوں کے ہیر پھیر کے سوا کوئی فرق نہیں ہے۔

فکری مکالمات

ایک شاگرد سے گفتگو

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگردوں میں سے ایک مشہور سائنس دان جابر بن حیان بھی تھے۔ ایک روز وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، ''کیا کائنات کی ہر چیز متحرک ہے؟'' آپ نے فرمایا، ''ہاں، اِس میں کوئی شک نہیں ہے۔''

جابر: کیا آواز بھی حرکت کرتی ہے؟

امامؑ: ہاں، آواز بھی حرکت کرتی ہے، مگر اِس کی رفتار روشنی کی رفتار سے سُست ہے۔ جب تم دُور سے دیکھتے ہو کہ ایک شخص لوہے کے ہتھوڑے کو اوزار پر مارتا ہے تو اُس کی آواز تھوڑی دیر بعد کانوں تک پہنچتی ہے، جبکہ ہتھوڑے کے وار سے جو روشنی نکلتی ہے وہ اُسی لمحے آنکھوں تک پہنچتی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ آواز کی رفتار روشنی کی رفتار سے سُست ہے اور دیر سے سنائی دیتی ہے۔

جابر: کس قدر دیر سے سنائی دیتی ہے؟

امامؑ: یہ اُس جگہ اور تمھارے درمیان فاصلے پر منحصر ہے۔ قریب کے مقام سے تم چند لمحوں کے بعد آواز سن لوگے، لیکن دُور کی جگہ سے آواز تمھارے کانوں

تک ذرا دیر میں پہنچے گی۔

جابر: اِس صورت میں تو جب کبھی خدا اپنے کسی پیغمبر سے بات کرنا چاہتا تو ہزاروں سال لگتے، کیونکہ وہ ساتویں آسمان پر ہے اور اِس دنیا سے اُس دنیا تک کا فاصلہ اِتنا زیادہ ہے کہ اُس کا حساب لگانے سے انسانی عقل قاصر ہے۔

امامؑ: یہ جو کہا گیا ہے کہ خدا ساتویں آسمان پر ہے، یہ اِس لیے کہا گیا ہے کہ عام لوگ اُس کی عظمت کا ادراک کر سکیں، ورنہ وہ تو ہر جگہ موجود ہے اور کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں وہ موجود نہ ہو، چنانچہ جب کبھی وہ اپنے کسی پیغمبر سے بات کرنا چاہتا تو اُس کے اِس قدر قریب ہوتا کہ جونہی اُس کی آواز بلند ہوتی، اُس کا پیغمبر سن لیتا، لیکن اگر وہ ساتویں آسمان پر بھی ہوتا تو بھی اُس کی آواز ایک لمحے میں اُس کے پیغمبر تک جا پہنچتی، کیونکہ اُس کی آواز انسان اور دوسری مخلوقات کے مانند نہیں ہے کہ اُسے سنائی دینے میں وقت درکار ہوتا ہو اور وہ فاصلے طے کرتی ہو۔

جابر: جب آپ یہ کہتے ہیں کہ خدا ہر جگہ موجود ہے تو لامحالہ آپ یہ بھی کہیں گے کہ وہ ہر چیز میں بھی ہے۔

امامؑ: ہاں، یہ درست ہے۔

جابر: اِس لحاظ سے تو جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خالق اور مخلوق ایک ہی ہیں تو وہ صحیح کہتے ہیں، کیونکہ جب ہم اِس امر کے قائل ہیں کہ خدا ہر چیز میں ہے تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر چیز، اگر چہ وہ پتھر، درخت اور پانی ہی کیوں نہ ہو، خدا ہے۔

امامؑ: یہ نتیجہ اخذ کرنا سراسر غلط ہے۔ خدا پتھر، درخت اور پانی میں تو ہے، لیکن پتھر، درخت اور پانی خدا نہیں ہیں۔ جس طرح تیل چراغ میں ہوتا ہے، لیکن چراغ تیل میں نہیں ہوتا۔ چراغ کی روشنی کا مایہ تیل اور فتیلہ ہے، لیکن

چراغ تیل اور فتیلہ نہیں ہے۔ تیل اور فتیلہ چراغ میں شعلہ پیدا کرتے ہیں، مگر چراغ یہ دعوا نہیں کر سکتا کہ چونکہ تیل اور فتیلہ اُس میں موجود ہیں، لہٰذا وہ تیل اور فتیلہ ہے۔ یہ محال ہے کہ مخلوق، جو خالق کی پیدا کی ہوئی ہے، خود خالق بن جائے۔ گزشتہ ادوار میں جو لوگ خالق اور مخلوق کی وحدت کا عقیدہ رکھتے تھے، وہ اپنے استدلال کی ظاہری شکل سے فریب کھاتے تھے۔ اُن کے مطابق چونکہ جو کچھ اِس کائنات میں موجود ہے، اُس میں خدا ہے، لہٰذا جو کچھ ہے، وہ خدا ہے۔ اگر یہ عقیدہ صحیح ہوتا تو تمام مخلوق خدائی طاقت کی حامل ہوتی، لیکن پوری کائنات میں ایک بھی وجود ایسا نہیں ہے جو خدائی طاقت رکھتا ہو۔ جو لوگ اِس عقیدے کے قائل ہیں، کیا اُن میں سے کوئی ایک بھی ایک پتھر ہی وجود میں لا سکا ہے؟ کیونکہ خالق اور مخلوق کی وحدت کا مطلب یہ ہے کہ انسان بھی خدا ہے اور انسان کی خدائی کا لازمہ یہ ہے کہ وہ ایسے کام کر سکے جو خدا کرتا ہے۔ ایک لفظ 'کُن' سے کائنات کو پیدا کرے اور ایک قطرے سے انسان کو وجود میں لائے۔

اے جابر! جان لو کہ اگرچہ خدا ہر چیز میں ہے، لیکن وہ اشیا خدا نہیں ہیں، بلکہ سب کی سب اُس کی مخلوق ہیں۔ وہ تمام جگہوں اور اشیا میں ایک خالق اور محافظ کے مانند ہے۔ وہی ہے جس نے حرکات کو پیدا کیا ہے اور اِنھی حرکات کی وجہ سے جمادات اپنی جمادی زندگی، نباتات اپنی نباتی زندگی اور حیوانات اپنی حیوانی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اِس کے باوجود کہ زندگی حرکت کے بغیر ناممکن ہے، کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ حرکت خدا ہے۔ اِس لیے کہ حرکت بھی دیگر مخلوقات کے مانند خدا کی مخلوق ہے۔ بعض یونانی حکما کا یہ کہنا کہ حرکت خدا ہے، سراسر غلط ہے، کیونکہ حرکت اُس وقت تک وجود میں نہیں آتی جب تک اُس کی قوت وجود میں نہ آئے۔ جب تک وہ قوت ہے، حرکت جاری رہے گی اور جب وہ قوت ختم

ہو جائے گی، حرکت بھی رُک جائے گی۔ چونکہ حرکت توانائی سے وجود میں آتی ہے، لہٰذا مخلوق ہے اور وہ توانائی جو حرکت کو وجود میں لاتی ہے، وہ خدائی قوت ہے۔ دراصل خدا نے کائنات کے اُمور چلانے کے لیے اسباب پیدا کیے ہیں، جن میں سے ایک حقیقی سبب حرکت ہے۔ بعض یونانی فلاسفہ کے مطابق حرکت مادّہ ہے اور مادّہ حرکت ہے۔ مادّہ اپنے آخری مرحلے میں حرکت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اگر حرکت مادّے میں رُک جائے تو مادّہ ختم ہو جاتا ہے۔ بعض یونانی فلاسفہ نے سوچ اور فکر کو بھی مادّے کا جزو شمار کیا ہے اور کہا ہے کہ مادّے کے بغیر سوچ اور فکر کا کوئی وجود نہیں ہے۔ جس طرح پھول کے بغیر اُس کی خوشبو کوئی نہیں سونگھ سکتا، اِسی طرح اگر مادّہ ختم ہو جائے تو سوچ اور فکر بھی ختم ہو جاتی ہے، لیکن اُن کا یہ نظریہ درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی چیز فنا نہیں ہوتی، بلکہ اپنی حالت تبدیل کرتی ہے۔ پس انسان بھی فنا نہیں ہوتا، بلکہ موت کے بعد اپنی حالت تبدیل کرتا ہے، اور اِس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان کسی دوسری صورت میں باقی رہتا ہے، اور اُس کی موت کے بعد اُس کے باقی رہنے والے عوامل اور صفات اُس کی روح ہے۔

جابر: دینِ اسلام کے حقائق اِس طرح نازل کیوں نہیں ہوئے کہ تمام لوگ اُنھیں اپنی عقلی سطح پر سمجھ سکتے؟

امامؑ: نہ صرف یہ کہ دینِ اسلام کے حقائق ہی اِس طرح نازل نہیں ہوئے کہ تمام لوگ اُنھیں سمجھ سکیں، بلکہ اسلام سے پہلے کے ادیان کے حقائق بھی اِس طرح نازل نہیں ہوئے تھے کہ تمام لوگ اُنھیں سمجھ کر اُن سے محظوظ ہو سکتے۔

اے جابر! جان لو کہ دین فلسفے سے جدا ہے۔ فلسفے میں یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے، اُس کے لیے استدلال کی ضرورت ہے تا کہ سامع کی عقل اُسے تسلیم

کرے۔ فلسفے کے مسائل انسانی عقل سے سروکار رکھتے ہیں، جبکہ دینی مسائل لوگوں کے ایمان سے تعلق رکھتے ہیں۔ دین کے حقائق کو عوام کے لیے دلیل سے بیان کرنے کے لیے اُن کے ساتھ علمی وضاحت پیش کرنا ضروری ہے اور اِس علمی وضاحت کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اگر عالم نہ ہوں تو کم از کم علم کے مقدّمات ضرور طے کر چکے ہوں، جبکہ ایک عام آدمی خیال کرتا ہے کہ اگر وہ علم حاصل کرنا شروع کر دے گا تو کئی برس تک مادّی فوائد سے محروم رہے گا، لیکن اِس کے بجائے اگر وہ تجارت، زراعت اور دیگر دنیوی اُمور میں سے کسی کو اختیار کر لے گا تو اُسے خاطر خواہ فائدہ ہوگا۔ پس عام لوگوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ صرف ایمان رکھتے ہوں اور اصول وفروعِ دین سے وہی کچھ اخذ کریں جو اُس کے ظاہر میں ہے۔

اے جابر! تم ایک عالم شخص ہو، تمھیں معلوم ہے کہ خدا کے کلام میں جنّت اور دوزخ کا جو ذکر آیا ہے، اُس سے کیا مراد ہے۔ تم سے پوشیدہ نہیں ہے کہ جنّت اور دوزخ کا اصل مفہوم کچھ اَور ہے، لیکن کیا تم اِس مفہوم کو ایک عام آدمی کے ذہن میں بٹھا سکتے ہو؟ صرف ایک صورت میں ایک عام آدمی جنّت اور دوزخ کے حقیقی مفہوم کو سمجھ سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ علم حاصل کرے، چنانچہ اگر وہ خود جنّت اور دوزخ کے حقیقی مفہوم کو نہ سمجھ سکے گا تو چونکہ وہ عالم ہوگا، لہٰذا اُن دونوں کی تشریح بیان کی جائے گی تو اُس سے سمجھ جائے گا، لیکن اگر تم آج جنّت اور دوزخ کے حقیقی مفہوم کو ایک عام آدمی کے ذہن میں بٹھانا چاہو گے تو اُس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اُس کا ایمان متزلزل ہو جائے گا۔ اِسی لیے کہا گیا ہے کہ لوگوں سے اُن کی عقل کے مطابق گفتگو کرو اور ہر ایک سے اُس زبان میں بات کرو جو اُس کی عقل اور فہم کے مطابق ہو۔ دین کے مخاطب تمام لوگ ہیں، لہٰذا خدا کا کلام

نہایت سادہ اسلوب میں نازل ہوا ہے، چنانچہ عام لوگ بھی اُس کے ظاہری معنوں کو سمجھ سکتے ہیں اور اِس سلسلے میں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

جابر: کس قدر افسوس کی بات ہے کہ لوگ دینِ مبین کے احکام کی مصلحت اور خدا کے کلام کے وسیع مفہوم کو سمجھنے کی جانب توجہ نہیں دیتے۔ میرا خیال ہے کہ اگر لوگ اِن نکات کی جانب توجہ دیں تو دین زیادہ وسیع ہو جائے گا۔

امامؑ: سابقہ ادیان میں لوگوں کی ایک اقلیت ہمیشہ ایسی رہی ہے جو احکامِ دین کو خوب سمجھتی تھی اور یوں دینی قوانین سے کماحقہٗ واقفیت کی بنا پر وہ دینی لحاظ سے لوگوں کے رہنما ہوتے تھے۔ اسلام میں بھی ایسا ہی ہے اور اِسی طرح آج بھی ایک اقلیت دینی لحاظ سے لوگوں کی رہبری کر رہی ہے اور آئندہ بھی ایک اقلیت عالم بن کر لوگوں کی دینی رہبری کا فریضہ انجام دے گی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کیفیت اُس وقت تک باقی رہے گی جب تک علم سب کے لیے عام نہیں ہو جاتا۔

جابر: کیا یہ ممکن ہے کہ علم تمام لوگوں کے لیے عام ہو جائے؟

امامؑ: ہاں، ایسا وقت آئے گا کہ جب انسان سمجھے گا کہ تمام انسانوں کو عالم بننا چاہیے اور وہ اِس کے لیے تمام وسائل بروئے کار لا کر تمام لوگوں کو علم حاصل کرنے کی طرف راغب کرے گا۔

جابر: لامحالہ اُس وقت تمام لوگ عالم بن جائیں گے؟

امامؑ: نہیں، اُس وقت بھی تمام لوگ عالم نہیں بن سکیں گے، کیونکہ لوگوں میں تحصیلِ علم کی استعداد میں فرق ہوگا۔ اگرچہ علم حاصل کرنے کے مواقع سب کے لیے یکساں ہوں گے، لیکن چونکہ اُن میں تحصیلِ علم کی استعداد یکساں نہیں ہوگی، اِس لیے بعض تو عالم بن جائیں گے اور بعض علم حاصل کرنے کی طرف راغب نہیں

ہوں گے اور کوئی اَور پیشہ اختیار کرلیں گے، چنانچہ کسی بھی دَور میں ایسا نہیں ہوگا کہ تمام لوگ عالم بن جائیں، تاہم اِس کے باوجود بھی لوگ عالم نہیں ہوں گے تو کم از کم خواندہ ضرور ہوں گے، لہٰذا علما اُنھیں دینی حقائق بہتر طور پر سمجھا سکیں گے۔

جابر: انسان کے ارادوں میں سے کون سا ارادہ سب سے زیادہ مضبوط ہے؟

امامؑ: زندگی کی حفاظت اور زندہ رہنے کا ارادہ۔

جابر: کیا اِس مضبوط ارادے کا سرچشمہ علم ہے؟

امامؑ: اِس ارادے کو زندگی کے سرچشمے سے تقویت ملتی ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جنھیں خود علم نہیں ہے کہ وہ زندہ رہنے کا ارادہ رکھتے ہیں، لیکن اُن میں بھی یہ ارادہ دوسرے لوگوں کے مانند قوی ترین ارادے کی حیثیت سے موجود ہے۔

جابر: بعض لوگ خودکشی پر کیوں مائل ہوتے ہیں؟

امامؑ: جو چیز انسان کو خودکشی پر مائل کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اُس میں زندہ رہنے کا ارادہ سُست پڑ جاتا ہے۔ ہر انسان میں سب سے مضبوط ارادہ زندہ رہنے کی طرف مائل رہتا ہے۔ یہ جذبہ انسان کو کام پر اُکساتا ہے اور اُسے شادی کرنے اور بیوی بچّوں کے لیے زندگی کی ضروریات مہیّا کرنے پر اُبھارتا ہے۔

اے جابر! جو اسباب انسان کے زندہ رہنے کا عزم ختم کردیتے ہیں، اُن میں سُستی بہت عام ہے۔ اکثر لوگ جو خودکشی کرتے ہیں، وہ سُست ہوتے ہیں۔ اگر کوئی اُن کے اندر جھانک سکے تو وہ محسوس کرے گا کہ اُن کے خودکشی کرنے کی اصل وجہ اُن میں پائی جانے والی سُستی ہے۔ دینِ اسلام کے احکام کا ایک مقصد انسان کو سُستی سے دُور رکھنا ہے۔

اے جابر! انسان فطرتاً آرام پسند ہے اور کام کرنے کا رجحان نہیں رکھتا۔ ہر انسان صبح کے وقت سونا چاہتا ہے، کیونکہ صبح کی نیند اُسے تمام اوقات سے زیادہ

پُر کیف محسوس ہوتی ہے، لیکن اسلام انسان کو سورج کے طلوع ہونے سے پہلے نماز پڑھنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ فریضہ انسان میں سُستی دُور کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ ایک مسلمان جب صبح کی نماز پڑھ لیتا ہے تو وہ روزمرّہ کے کاموں کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح دوسری چار نمازیں بھی اِسی لیے فرض کی گئی ہیں کہ مسلمان سُستی سے دُور رہیں۔

جابر: خدا انسان کو پیدا کرنے کے بعد مارتا کیوں ہے؟

امامؑ: موت کے بارے میں جس طرح کا تصوّر پایا جاتا ہے، وہ درست نہیں ہے، بلکہ یہ ایک حالت کی تبدیلی ہے۔ ایک مومن اگر عالم ہے تو وہ حالت کی اِس تبدیلی سے نہیں ڈرتا، کیونکہ اُسے علم ہے کہ موت کے بعد وہ زندہ ہو گا۔

اے جابر! کیا تم اپنی ماں کے شکم میں زندہ نہیں تھے، لیکن کیا تم، جو ایک عالم شخص ہو، یہ گمان نہیں کرتے کہ تمھارا ماں کے شکم سے باہر نکلنا اور اِس دنیا میں وارد ہونا شاید ایک طرح کی موت تھی، لیکن کیا تم اِس بات کی تصدیق کرتے ہو کہ جس دنیا میں تم زندگی گزار رہے ہو، وہ ماں کے شکم کی دنیا سے بہتر ہے؟

جابر: اگرچہ مجھے ماں کے شکم میں اپنی زندگی کی کیفیت کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے، لیکن میں اِس بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ میری یہ زندگی ماں کے شکم کی زندگی سے بہتر ہے۔

امامؑ: پس اِسی سے سمجھ لو کہ موت کے بعد ہماری زندگی اِس دنیا کی زندگی سے بہتر ہوگی۔

جابر: اگر بہتر نہ ہوئی تو؟

امامؑ: جو لوگ اِس جہان میں خدا کے احکام پر عمل کرتے ہیں، اُن کی دوسرے جہان کی زندگی اِس جہان کی زندگی سے بہتر ہوگی اور اِس میں شک و

شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ خدا نے اِس بارے میں اپنے بندوں سے واضح وعدہ فرمایا ہے۔ وہ دانا اور عادل ہے۔ وہ کبھی اپنے بندوں کو اچھے جہان سے بُرے جہان کی طرف نہیں لے جائے گا۔ اگر ہم اِس امر کے قائل ہیں کہ انسانی تخلیق کا مقصد اِسے کمال تک پہنچانا ہے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ انسان کی زندگی کا ہر لمحہ اِس کے کمال میں اضافہ کرتا ہے، لہٰذا اُس جہان میں انسان کی زندگی کی حالت اِس جہان کی زندگی کی حالت سے بہتر ہوگی۔

جابر: کیا موت کے بعد ہم اپنے آپ کو پہچانیں گے؟

امامؑ: موت کے بعد نہ صرف نیک لوگ ہی اپنے آپ کو پہچانیں گے، بلکہ گناہ گار لوگ بھی اپنی اصلیت سے واقف ہوں گے۔ اگر وہ اپنی حقیقت سے آگاہ نہ ہوں گے تو پھر وہ کیسے اِس دنیا کا حساب دے سکیں گے۔

جابر: چونکہ میں مسلمان ہوں، لہٰذا میرا ایمان ہے کہ میں دوسری دنیا میں اپنے آپ کو پہچانوں گا، لیکن اگر اِس موضوع پر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ماں کے شکم میں زندگی کی کیفیت سے میری بے خبری اِس امر کی دلیل نہیں ہے کہ میں مرنے اور اِس جہان سے رخصت ہو جانے کے بعد دوسرے جہان میں اپنے آپ کو نہیں پہچان سکوں گا؟

امامؑ: کیا تم خواب دیکھتے ہو؟

جابر: جی ہاں، بہت سے خواب دیکھتا ہوں۔

امامؑ: کیا تم خواب کے دوران ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہو؟

جابر: جی ہاں، کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے۔

امامؑ: تم کس کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہو؟

جابر: میں اپنی روح کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا ہوں۔

امامؑ: کیا تمھیں یقین ہے کہ یہ تمھاری اپنی روح ہے؟
جابر: جی ہاں، اِس میں کوئی شک نہیں ہے۔
امامؑ: کیا یہ روح جو نقلِ مکانی کرتی ہے، تم سے جدا ہوتی ہے؟
جابر: جی ہاں، اگر یہ مجھ سے جدا نہ ہوتی تو ہرگز نقلِ مکانی نہ کرسکتی۔
امامؑ: پس ثابت ہوا کہ خواب کے دوران تمھاری روح ایک آزاد زندگی کی حامل ہوتی ہے اور جہاں جانا چاہے جاتی ہے اور جو کرنا چاہے کرتی ہے۔ کیا تم فلسفے کے اِس اصول کو تسلیم کرتے ہو کہ جو چیز وجود میں آتی ہے، وہ ختم نہیں ہوتی؟
جابر: جی ہاں، میں اِس اصول کو تسلیم کرتا ہوں۔
امامؑ: پس تمھاری روح جو خلق ہوئی ہے، تمھاری موت کے بعد بھی ختم نہیں ہوگی، لہٰذا تم بھی باقی رہو گے اور موت کے بعد اپنے آپ کو پہچانو گے۔
جابر: کیا موت کے بعد ہم خدا کو دیکھ سکیں گے؟
امامؑ: نہیں، موت کے بعد بھی ہم خدا کو نہیں دیکھ سکیں گے، کیونکہ خدا کا جسم نہیں ہے۔ ہماری آنکھیں ایسی چیز کو نہیں دیکھ سکتیں جس کا جسم نہ ہو اور جس پر روشنی نہ پڑتی ہو۔ ہماری آنکھیں تاریکی میں بھی چیزوں کو دیکھنے پر قادر نہیں ہیں تو ہم کس طرح اِنھی آنکھوں سے خدا کو دیکھ سکیں گے جس کا جسم نہیں ہے۔

ایک مخالف سے گفتگو

حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام کے مخالفین میں سے ایک مشہور ملحد ابوشاکر دیصانی بھی تھا۔ ایک روز وہ آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا، آپ اپنے شاگردوں اور سامعین کو افسانے کے ذریعے کیوں فریب دیتے ہیں؟ آپ جو کچھ خدا کے بارے میں کہتے ہیں، وہ افسانے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ آپ

افسانہ سرائی کے ذریعے لوگوں کو ایک ایسی چیز قبول کرنے پر مائل کرتے ہیں جس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ خدا کی عدمِ موجودی کی دلیل یہ ہے کہ ہم اپنے حواسِ خمسہ کے ذریعے اُسے محسوس نہیں کر سکتے۔ اگر آپ کہیں کہ ہم اپنے باطنی حواس کے ذریعے خدا کی معرفت حاصل کرتے ہیں تو میں کہوں گا کہ باطنی حواس سے کام لینے کے لیے بھی ظاہری حواس سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کہیں کہ نہ تو ہم خدا کو اپنے باطنی حواس کے ذریعے محسوس کرتے ہیں اور نہ ہی ظاہری حواس کے ذریعے اُس کی معرفت حاصل کرتے ہیں، بلکہ اپنی عقل کے ذریعے اُس کے وجود تک پہنچتے ہیں تو میں کہوں گا کہ ہماری عقل بھی کسی ظاہری حس کے بغیر کسی چیز کو سمجھنے پر قادر نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ اِس کائنات کو خدا نے خلق کیا ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ کائنات کو کسی نے خلق نہیں کیا ہے، بلکہ یہ خود بہ خود وجود میں آئی ہے۔ کیا صحرا کی گھاس کو کوئی پیدا کرتا ہے؟ کیا چیونٹی کو کوئی خلق کرتا ہے؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ یہ نباتات اور مخلوقات خود بہ خود وجود میں آتی ہیں؟ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ آپ سے فریب کھاتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں کہ خدا موجود ہے جو دیکھا نہیں جا سکتا ہے، لیکن میں آپ کے فریب میں نہیں آتا۔ میں ایک ایسے خدا کی پوجا کرتا ہوں جو پتھر کا بنا ہوا ہے، کیونکہ میں اُسے اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ سکتا ہوں اور اپنے دونوں ہاتھوں سے چھو سکتا ہوں۔ آپ کہتے ہیں کہ چونکہ خود میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے خدا کو تراشا ہے، لہٰذا مجھے زیب نہیں دیتا ہے کہ میں اُس کی پوجا کروں، لیکن میں کہتا ہوں کہ دکھائی نہ دینے والا خدا، جس کی عبادت کے لیے آپ لوگوں کو دعوت دیتے ہیں، آپ کے اپنے تخیل کی پیداوار ہے۔ میں اور آپ اپنے اپنے خداؤں کو خود تخلیق کرتے ہیں، فرق صرف اِتنا ہے کہ میرا خدا دکھائی دیتا ہے اور اُسے چھوا جا سکتا ہے، جبکہ آپ کا خدا نہ تو دکھائی دیتا

ہے اور نہ ہی اُسے چھوا جا سکتا ہے۔ چونکہ میں افسانے کی پیروی نہیں کرتا، اِس لیے میں یہ نہیں کہتا کہ اُس نے مجھے اور کائنات کو تخلیق کیا ہے، لیکن چونکہ آپ افسانے پر یقین رکھتے ہیں، اِس لیے آپ یہ کہتے ہیں کہ اُس نے کائنات اور انسان کو تخلیق کیا ہے۔ خالق ہم ہیں نہ کہ خدا۔ یہ ہم ہیں جو اپنے اپنے خدا کو وجود میں لاتے ہیں۔ میں اپنے خدا کو اپنے ہاتھوں سے تراش کر وجود میں لاتا ہوں، جبکہ آپ اپنے خدا کو اپنے تخیّل سے وجود میں لاتے ہیں۔

جب ابو شاکر یہ گفتگو کر رہا تھا تو آپ نے ایک بار بھی اُس کی قطعِ کلامی نہیں کی۔ آپ کے جو شاگرد اُس مجلس میں موجود تھے، اُنھوں نے کچھ کہنا چاہا، لیکن آپ نے اُنھیں منع کر دیا۔ جب اُس کی گفتگو ختم ہو چکی تو اُس کے بعد بھی آپ منتظر رہے کہ شاید وہ کچھ اَور کہے۔ پھر آپ نے اُس سے پوچھا، ''کیا تمھاری بات ختم ہو گئی ہے؟ تم کچھ اَور تو نہیں کہنا چاہتے؟'' اُس نے کہا، ''میری آخری بات یہ ہے کہ آپ اِس لیے لوگوں کو اَن دیکھے خدا کی پرستش کی دعوت دیتے ہیں کہ اُس کے ذریعے اثر ورسوخ پیدا کریں، دولت مند بنیں اور خوش حال زندگی گزاریں۔'' آپ نے فرمایا، چونکہ تمھاری گفتگو ختم ہو گئی ہے، لٰہذا اب میں جواب دیتا ہوں اور اپنے جواب کو تمھاری گفتگو کے آخری حصّے سے شروع کرتا ہوں۔ تم نے کہا ہے کہ میں اِس لیے لوگوں کو اَن دیکھے خدا کی پرستش کی دعوت دیتا ہوں کہ اِس کے ذریعے اثر ورسوخ پیدا کروں، دولت مند بنوں اور خوش حال زندگی گزاروں۔ تم نے میری روز مرّہ کی غذا دیکھی ہے اور مشاہدہ کیا ہے کہ میں کتنے لقمے سوکھی روٹی کھاتا ہوں۔ میں تمھیں دعوت دیتا ہوں کہ آج رات میرے گھر آؤ اور مشاہدہ کرو کہ میرے گھر میں کس قدر سامان ہے؟ اگر میں دولت جمع کرنے کا خواہش مند ہوتا تو ضروری نہیں تھا کہ میں خدا پرستی کی تبلیغ کے ذریعے ہی

دولت حاصل کرتا، بلکہ میں کیمیا دانی کے ذریعے بھی دولت مند بن سکتا تھا اور اگر اِس ذریعے سے دولت حاصل نہ کرنا چاہتا تو تجارت کے ذریعے دولت مند بن سکتا تھا، کیونکہ دوسرے ممالک کے بارے میں میری معلومات تمام تاجروں سے زیادہ ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ کون سے ملک میں کس قسم کا سامان تیار ہوتا ہے اور کون سی اقسام کا سامان دوسرے ممالک میں لے جانا سود مند ہے۔ تم اِس شہر کے تاجروں سے ایسی معلومات کے بارے میں پوچھو، وہ اُس سے ناواقف ہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ غیر ممالک میں کون سا ایسا سامان موجود ہے جسے لا کر فروخت کیا جائے تو خاطر خواہ منافع ہوگا اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اُس سامان کو کس راستے سے لایا جائے تو ترسیل کا خرچ کم سے کم آئے گا۔

اے ابوشاکر! میں نے سنا ہے کہ تمھارا باپ موتیوں کا کاروبار کرتا تھا۔ اگر تم موتی شناس ہو تو میں تمھیں بتاتا ہوں کہ میں ہر قسم کے جواہرات کی شناخت رکھتا ہوں۔ اگر میں دولت جمع کرنے کا خواہش مند ہوتا تو جواہرات کا کاروبار کر کے بھی دولت مند بن سکتا تھا۔

اے ابوشاکر! تم نے کہا ہے کہ میں خدا پرستی کی تبلیغ کے ذریعے لوگوں کو فریب دے کر مال و دولت حاصل کرنا چاہتا ہوں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ میں نے جب سے خدا پرستی کی تبلیغ شروع کی ہے، لوگوں سے کچھ حاصل نہیں کیا ہے، البتہ میرا ایک دوست اپنے باغ سے کچھ کھجوریں مجھے بھیجتا ہے اور میں یہ تحفہ اِس لیے قبول کر لیتا ہوں کہ میرا دوست خفا نہ ہو جائے۔ اِسی طرح میرا ایک دوست اپنے باغ سے چند انار مجھے بھیجتا ہے اور میں دوست کی ناراضی کے احساس سے یہ تحفہ قبول کر لیتا ہوں۔ تم تسلیم کرو گے کہ کوئی شخص ایک عرصے تک محض اِس لیے لوگوں میں تبلیغ نہیں کرتا کہ اُس کے صلے میں اُسے سال میں ایک مرتبہ چند انار

اور کچھ کھجوریں حاصل ہوں۔

اے ابوشاکر! تم نے کہا ہے کہ میں افسانہ سرائی کرتا ہوں اور لوگوں کو ایک ایسے خدا کی عبادت کی دعوت دیتا ہوں جو دکھائی نہیں دیتا ہے۔ تم جو اَن دیکھے خدا کے منکر ہو، کیا اپنے اندر دیکھ سکتے ہو؟

ابوشاکر: نہیں۔

امامؑ: جب تم اپنے اندر نہیں دیکھ سکتے تو تمھیں یہ نہیں کہنا چاہیے کہ اَن دیکھے خدا کی موجودی ایک افسانے سے زیادہ نہیں ہے۔ کیا تم اپنے جسم میں خون کی حرکت کی آواز سن سکتے ہو؟

ابوشاکر: نہیں، کیا خون جسم میں حرکت کر رہا ہے؟

امامؑ: ہاں، خون تمھارے جسم میں چند لحموں میں ایک مرتبہ گردش مکمل کر لیتا ہے۔ اگر خون کی یہ گردش چند لحموں کے لیے رُک جائے تو تم مر جاؤ گے۔ کیا تم اپنے جسم میں خون کی گردش محسوس کرتے ہو؟

ابوشاکر: نہیں، میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ خون جسم میں متحرک ہے۔

امامؑ: جو چیز اِس حقیقت کو تسلیم کرنے میں مانع ہے، وہ تمھاری جہالت ہے اور یہی جہالت اَن دیکھے واحد خدا کو تسلیم کرنے میں مانع ہے۔ کیا تم اُن مخلوقات سے واقف ہو جو خدا نے تمھارے جسم میں تخلیق کر کے کام پر لگا دی ہیں اور جن کی وجہ سے تم زندہ ہو؟

ابوشاکر: نہیں۔

امامؑ: چونکہ تم اپنے مشاہدات پر تکیہ کرتے ہو، اِس لیے جو کچھ تمھیں نظر نہیں آتا، اُس کا انکار کر دیتے ہو، حالانکہ تمھیں اپنی لاعلمی کا اظہار کرنا چاہیے۔ اگر تم اپنی جہالت کو کم کرنے کی کوشش کرتے تو تمھیں پتا چلتا کہ تمھارے جسم میں

اِس قدر زندہ مخلوقات ہیں جن کی تعداد بیابان کی ریت کے ذرّات کے برابر ہے۔ وہ تمھارے جسم کے اندر ہی پیدا ہوتی ہیں، نشو ونما پاتی ہیں، افزائشِ نسل کرتی ہیں اور ایک عرصے کے بعد ختم ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ جان دار مخلوقات، جنھیں خدا نے تمھارے جسم کے اندر کام پر لگا رکھا ہے، اپنا کام چھوڑ دیں تو تم مر جاؤ گے، لیکن چونکہ تم جاہل ہو، لہٰذا اُن کے وجود کا انکار کرتے ہو۔ تمھارا خیال ہے کہ جو چیز تمھیں اپنے جسم کے اندر موجود اُن مخلوقات کا انکار کرنے پر اُکساتی ہے وہ تمھاری فہم و فراست ہے، حالانکہ یہ تمھاری بے عقلی اور ناسمجھی ہے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی آنکھیں تو ہیں، لیکن دیکھتے نہیں اور جن کے کان تو ہیں، لیکن سنتے نہیں اور اپنی جہالت کو علم اور حماقت کو عقل خیال کرتے ہیں۔ اِسی لیے کہا گیا ہے کہ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا، اُس نے خدا کو پہچان لیا۔ اگر تم اپنے آپ کو پہچان لیتے اور جان لیتے کہ تمھارے جسم کے اندر کیا وقوع پذیر ہو رہا ہے تو تم ہرگز یہ نہ کہتے کہ چونکہ میں خدا کو نہیں دیکھ سکتا، اِس لیے اُس کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا۔

اے ابوشاکر! تم نے کہا ہے کہ اِس دنیا میں جو کچھ وجود میں آتا ہے، وہ خود بہ خود وجود میں آتا ہے اور اُس کا خالق کوئی نہیں ہے۔ تمھارا کہنا ہے کہ گھاس صحرا میں خود بہ خود اُگتی ہے اور اُسے کوئی نہیں اُگاتا، لیکن تم نے یہ خیال نہیں کیا کہ جب تک صحرا میں گھاس کا بیج نہ ہو اُس وقت تک گھاس نہیں اُگتی اور گھاس کا بیج زمین پر گرنے کے بعد اُس وقت تک نہیں پھوٹتا جب تک بارش زمین کو نم نہ کر دے اور بارش خود بہ خود نہیں برستی، بلکہ زمین سے اُٹھنے والے بخارات، جو بادل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، برستے ہیں اور وہ بھی ہر وقت نہیں برستے، بلکہ خاص خاص موسموں میں برستے ہیں۔ اگر یہ سب کچھ نہ ہو تو صحرا میں کسی قسم کی گھاس نہیں

اُگ سکتی۔ تم دس اقسام کے گھاس کے بیج ایک بند برتن میں رکھ دو اور اُس میں پانی بھی ڈال دو اور پھر مشاہدہ کرو کہ اُن کی جڑیں نکلتی ہیں یا نہیں، کیونکہ گھاس کو سبز ہونے کے لیے صرف نمی کافی نہیں ہے، بلکہ ہوا کی بھی ضرورت ہے اور ہوا میں ایسا اثر ہوتا ہے جس کی وجہ سے گھاس اُگتی اور پھلتی پھولتی ہے۔ صحرا میں گھاس کے اُگنے کے لیے جہاں مٹّی، ہوا، بارش اور متعلّقہ موسم کا ہونا ضروری ہے وہیں ایک ایسی قوت کا ہونا بھی ضروری ہے جو اِن تمام عوامل کو باہم یکجا کرے اور وہ قوت خدا ہے۔ اگر تم عقل مند ہوتے تو تمھیں معلوم ہوتا کہ حکمت کسی بھی چیز کے خود بہ خود وجود میں آنے کو تسلیم نہیں کرتی۔ کسی بھی چیز کے وجود میں آنے کے لیے اُس کے خالق کا ہونا ضروری ہے، خواہ وہ جمادات ہوں، نباتات ہوں یا حیوانات ہوں۔ تمام مکاتبِ فکر کے حکما میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں گزرا ہے جو خالق کا معتقد نہ ہو، حتّا کہ وہ لوگ جو مُطلقاً خدا کی نفی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ خالق کا وجود نہیں ہے، وہ بھی اپنی حکمت میں کسی مبدا کے معتقد تھے۔

اے ابوشاکر! خالق کا انکار جہالت ہے نہ کہ دانش مندی، اور تمھارا یہ کہنا کہ ہم اپنے اپنے خداؤں کو خود تخلیق کرتے ہیں، اِس فرق کے ساتھ کہ تم اپنے خدا کو اپنے ہاتھوں سے تراش کر وجود میں لاتے ہو اور میں اپنے خدا کو اپنے تخیّل سے وجود میں لاتا ہوں، سراسر غلط ہے۔ تمھارے خدا اور میرے خدا میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ جب تم اوزار ہاتھ میں لیتے ہو اور کام شروع کرتے ہو تو تمھارا خدا موجود نہیں ہوتا، لیکن میرا خدا میرے سوچنے سے بھی پہلے موجود ہوتا ہے۔ تم ایک پہاڑ کو دیکھتے ہو اور اُس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کرتے ہو تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ تم نے اُسے اپنے غور و فکر سے ایجاد کیا ہے؟ پہاڑ تم سے

پہلے بھی تھا اور تمھارے بعد بھی رہے گا۔ تمھارا کام یہ ہے کہ اُسے اچھی طرح پہچانو۔ یہ پہچان بھی معرفت کی حد تک محدود ہے، کیونکہ تمھاری دانائی اِتنی نہیں ہے کہ تم پہاڑ کے مبدا کی شناخت کر سکو اور یہ جان سکو کہ یہ کس چیز سے بنا ہے اور اِس میں کون کون سی دھاتیں موجود ہیں اور وہ دھاتیں اِس سے نکالی جائیں تو انسان کو کیا کیا فائدے پہنچا سکتی ہیں؟ تمھیں معلوم نہیں کہ پہاڑ میں موجود پتھر کس وقت اور کیسے وجود میں آئے؟ اگر تم دانش مند ہوتے تو ہرگز یہ نہ کہتے کہ تم اپنے خدا کو اپنے ہاتھوں سے تراش کر وجود میں لاتے ہو، کیونکہ وہ پتھر، جس سے تم بت تراشتے ہو، ہزاروں سال پہلے بھی موجود تھا اور تمھارے بعد بھی موجود رہے گا۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ جس پتھر سے تم بت تراشتے ہو، وہ بہت دُور دَراز کے علاقے سے آیا ہے، کیونکہ زمین کے مختلف حصّے مسلسل حرکت کر رہے ہیں، لیکن چونکہ اُن کی حرکت سُست ہے، اِس لیے ہم اُسے دیکھ نہیں سکتے۔ اگر تم سمجھ دار ہوتے تو تمھیں معلوم ہوتا کہ اِس دنیا میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جو متحرک نہ ہو۔ دنیا میں جمود بے معنی ہے۔ ہم کسی حال میں بھی ساکن نہیں ہیں، حتّٰی کہ ہم سوتے ہوئے بھی زمین کی حرکت کے ساتھ ساتھ حرکت کرتے ہیں اور یہ حرکت ہمارے اندر موجود حرکات کے علاوہ ہوتی ہے۔

اے ابوشاکر! اگر تم پتھر کے اُس ٹکڑے کو، جس سے تم بت تراشتے ہو، پہچان لیتے تو اِتنی آسانی سے خدا کے وجود کا انکار نہ کرتے اور ہرگز یہ نہ کہتے کہ میرا خدا میرے تخیّل کی پیداوار ہے۔ چونکہ تم پتھر کو نہیں پہچانتے، لہٰذا خیال کرتے ہو کہ پتھر تمھارے ہاتھوں کا مطیع ہے اور تم اُسے جس شکل میں چاہو تراش سکتے ہو۔ ایسا اِس لیے ہے کہ خدا نے پتھر کو ایک مائع سے وجود میں لایا ہے۔

ابوشاکر: کیا اِتنا سخت پتھر پانی سے بنایا گیا ہے؟

امامؑ: میں نے یہ نہیں کہا ہے کہ یہ پانی سے بنایا گیا ہے، بلکہ میں نے یہ کہا ہے کہ یہ شروع میں مائع حالت میں تھا۔

ابوشاکر: مائع اور پانی ایک ہی تو ہیں؟

امامؑ: بعض چیزیں ایسی ہیں جو مائع ہیں، لیکن پانی نہیں ہیں یا خالص پانی نہیں ہیں۔ دودھ مائع ہے، لیکن پانی نہیں ہے اور سرکہ مائع ہے، لیکن کوئی اُسے پانی نہیں سمجھتا ہے، لیکن اِن دونوں میں پانی کی مقدار موجود ہے۔ پتھر بھی شروع میں مائع تھا، لیکن پانی نہیں تھا، بلکہ رطوبت کی شکل میں تھا اور اُس سے کافی مقدار میں حرارت نکل رہی تھی۔ خدا کی قدرت کہ وہ آہستہ آہستہ اِس قدر ٹھنڈا ہو گیا کہ اُس کی شکل جامد ہو گئی اور آج تم اُس سے بت تراش سکتے ہو، لیکن یہی پتھر جو جامد حالت میں ہے اگر اِسے زیادہ حرارت پہنچائی جائے تو یہ مائع شکل اختیار کر لے گا۔

ابوشاکر: جب میں گھر جاؤں گا تو پتھر کو آگ میں ڈال کر دیکھوں گا کہ یہ مائع شکل اختیار کرتا ہے یا نہیں؟

امامؑ: تمھاری انگیٹھی کی حرارت پتھر کو نہیں پگھلا سکتی۔ کیا تم اپنی انگیٹھی کی حرارت سے لوہے کے ایک ٹکڑے کو پگھلا سکتے ہو؟

ابوشاکر: نہیں۔

امامؑ: پتھر کو پگھلانے کے لیے ایک خاص قسم کی بھٹی درکار ہے، جس میں بہت زیادہ حرارت پیدا کی جائے تو یہ مائع حالت میں تبدیل ہو جائے گا۔

اے ابوشاکر! جب تم ایک بت تراشتے ہو اور اُسے اپنا خدا تصور کرتے ہو تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ پتھر کا وہ ٹکڑا تمھاری حاجات بر لائے گا؟ اگر تم بیمار ہو جاؤ گے تو وہ تمھیں شفا دے گا؟ اگر متعدی بیماری کی صورت میں کوئی وبا پھوٹ پڑے گی تو

وہ تمھیں اُس سے نجات دلائے گا؟ اگر تم کسی کے قرض دار ہو جاؤ گے تو وہ تمھارا قرض اتار دے گا؟ اور اگر بارش نہ ہوگی تو وہ خشکی کو دُور کرنے کے لیے بارش برسائے گا؟

ابوشاکر: میں پتّھر سے اِس طرح کی امیدیں نہیں رکھتا۔

امامؑ: تو پھر کس سے اِس طرح کی امیدیں رکھتے ہو؟

ابوشاکر: میں صحیح طور سے نہیں بتا سکتا کہ میری اِس طرح کی امیدیں کس سے وابستہ ہیں، لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ پتّھر کے اندر کوئی ایسی چیز ہے جو یہ سب کام کرسکتی ہے۔

امامؑ: کیا پتّھر کے اندر اُس کی جنس سے کوئی چیز ہے؟

ابوشاکر: اگر پتّھر کی جنس سے کوئی چیز ہوتو وہ یہ سب کام نہیں کرسکتی۔

امامؑ: تمھارے مطابق جو کچھ پتّھر کے اندر ہے، وہ پتّھر کی جنس سے نہیں ہے اور تمام کام انجام دے سکتا ہے۔ دراصل وہ وہی اَن دیکھا واحد خدا ہے۔

ابوشاکر: کیا دکھائی نہ دینے والا واحد خدا پتّھر کے اندر موجود ہے؟

امامؑ: وہ واحد خدا ہر چیز کے اندر اور ہر جگہ موجود ہے۔

ابوشاکر: میری عقل اِس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ ایک چیز ہر جگہ موجود ہو، لیکن دکھائی نہ دے۔

امامؑ: کیا تمھاری عقل اِس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتی کہ ہوا دکھائی نہیں دیتی، پھر بھی ہر جگہ موجود ہے۔

ابوشاکر: اگرچہ ہوا دکھائی نہیں دیتی، لیکن جب وہ چلتی ہے تو محسوس کی جاسکتی ہے، لیکن آپ کا خدا جو دکھائی نہیں دیتا، اُسے محسوس بھی نہیں کیا جاسکتا۔

امامؑ: جب ہوا نہیں چلتی تو کیا تم اُسے محسوس کرتے ہو؟

ابوشاکر: نہیں۔

امامؑ: کیا تم اِس بات کی تصدیق کرتے ہو کہ جو کچھ تم دیکھ نہیں پاتے اور محسوس نہیں کرتے، وہ ہر جگہ موجود ہے؟

ابوشاکر: جی ہاں، میں اِس بات کی تصدیق کرتا ہوں۔

امامؑ: خدا بھی دکھائی نہ دینے کے باوجود ہر جگہ موجود ہے، جس طرح ہوا موجود ہے، لیکن ہوا چونکہ عنصر اور مخلوق ہے، اِس لیے خالق اور مخلوق کے درمیان ماہیئت کے لحاظ سے کوئی شباہت نہیں پائی جاتی۔

اے ابوشاکر! وہ شعور جو تمھیں ایک پتھر سے بت تراشنے اور اُس کی پرستش کے لیے کہتا ہے، وہ خود تمھارے مطابق تمھیں کہتا ہے کہ اِس بت سے تمھیں کوئی امید وابستہ نہیں رکھنی چاہیے، کیونکہ وہ کسی کام کے کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے، تاہم اُس کے اندر کوئی ایسی چیز ہے جو تمھاری حاجات برلا سکتی ہے۔ یہ شعور، جو تمھیں بت تراشنے پر مائل کرتا ہے، گویا تمھیں یہ تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ تم خدا کی پرستش کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اُس کی پرستش تمھارے لیے ناگزیر ہے۔

اے ابوشاکر! انسان کے لیے خدا کی عبادت ایک لازمی امر ہے۔ اگر وہ خدا کی عبادت نہیں کرے گا تو نہ تو اُسے زندگی میں کوئی رہنما ملے گا اور نہ ہی وہ کسی چیز پر تکیہ کر سکے گا۔ اگر کوئی شخص خدا کی عبادت نہیں کرتا تو اُس کی مثال ایسی ہے کہ اُس نے ایک لمحے میں حواسِ خمسہ کو ضائع کر دیا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ کیا کرے، کہاں جائے اور کس کا سہارا لے؟

اے ابوشاکر! خدا کی پرستش اِس قدر ضروری ہے کہ جانور بھی اُس سے بے نیاز نہیں ہیں۔ اگر ہم اُن کی زبان سمجھ سکتے تو ہمیں معلوم ہوتا کہ وہ بھی خدا کی حمد و ثنا

کرتے ہیں، تاہم عقل کی بِنا پر ہم یہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اُن کی زندگی میں پایا جانے والا نظم وضبط اِس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ خدا کی پرستش اور اطاعت کرتے ہیں۔

اے ابوشاکر! تمھیں معلوم ہے کہ موسمِ بہار کے آنے پر مہاجر پرندہ مقررہ ایام میں آتا ہے اور اُس کا آنا اِس قدر منظم ہے کہ اگر سردیوں کے آخری دنوں کی ہوا ٹھنڈی ہو تو وہ آٹھ دس روز میں سفر طے کر کے پہنچ جاتا ہے۔ اُس کے بعد ابابیل آتی ہے اور اُسی جگہ گھونسلا بناتی ہے جہاں اُس نے گزشتہ موسمِ بہار میں بنایا تھا، حالانکہ وہ ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے پہنچتی ہے۔ کیا خدا کی پرستش اور اطاعت کے بغیر یہ چھوٹے چھوٹے پرندے اِس قدر منظم زندگی گزار سکتے ہیں؟

اے ابوشاکر! درخت بھی خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ اگر وہ خدا کی اطاعت نہ کرتے تو اُن کی زندگی اِس قدر منظم نہ ہوتی۔ اِسی طرح جمادات بھی خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ اگر وہ خدا کی اطاعت نہ کرتے تو اُن کی زندگی درہم برہم ہو جاتی۔

اے ابوشاکر! اگر خدا موجود نہ ہوتا تو یہ جہان بھی وجود میں نہ آتا۔ 'اگر خدا موجود نہ ہوتا' محض ایک بے معنی جملہ ہے، کیونکہ یہ محال تھا اور ہے کہ خدا موجود نہ ہوتا۔ وہ واجب الوجود ہے۔ اگر وہ مجھے اور تمھیں پیدا نہ کرتا تو یہ بے معنی الفاظ 'اگر خدا موجود نہ ہوتا' ہرگز ہمارے تخیل میں نہ آتے۔

محمد خالد جذبی
جمعۃ المبارک
۲۹ شوال المکرم ۱۴۲۳ھ
۳ جنوری ۲۰۰۳ء

☆